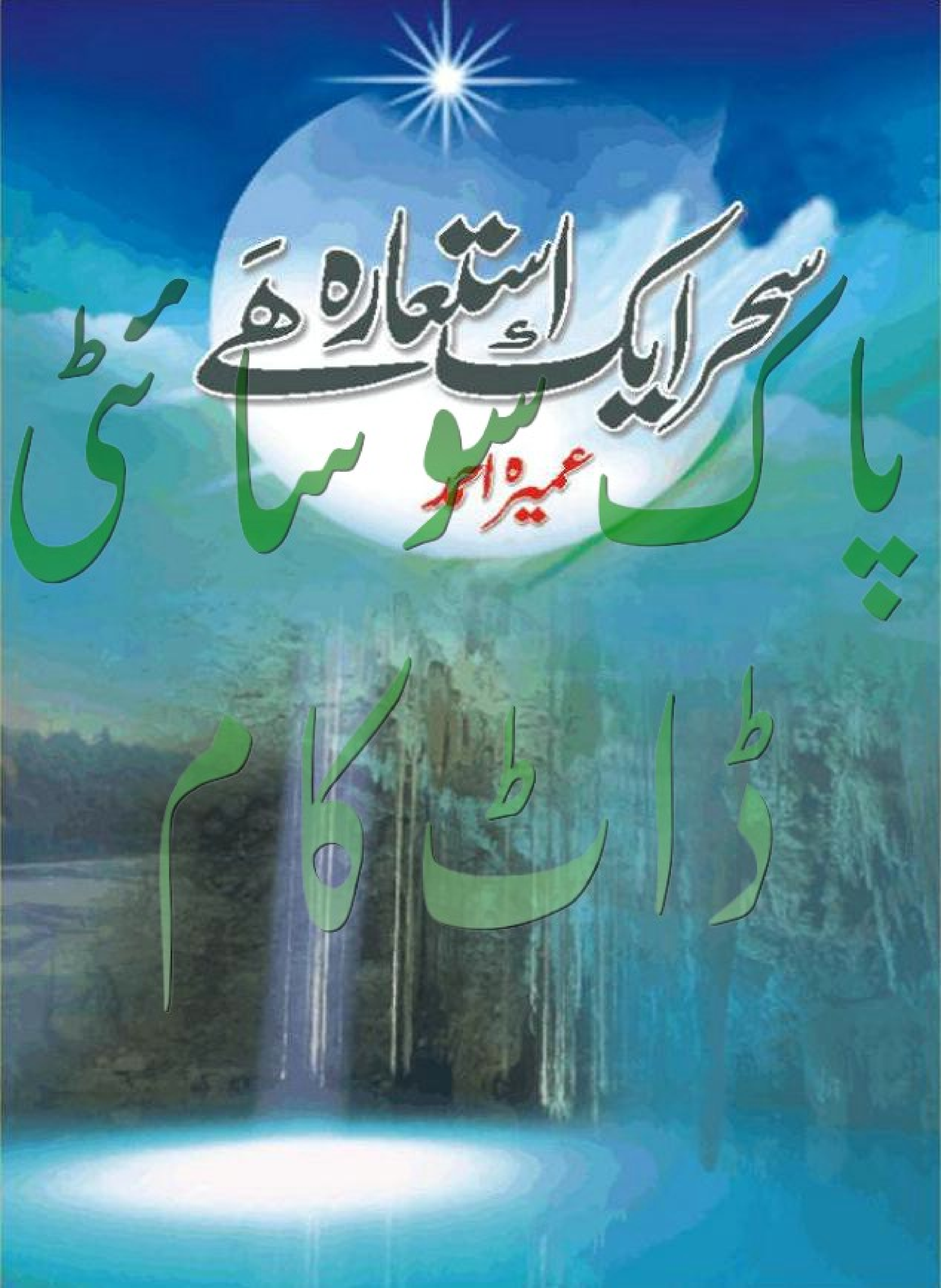

سحر ایک استعارہ ہے
عمیرہ احمد

عمیرہ احمد کی ۵ خوبصورت تحریروں کا مجموعہ.....سحر ایک استعارہ ہے

سحر ایک استعارہ ہے

عمیرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور
فون:042-37352332-37232336

نام کتاب	....	سحر ایک استعارہ ہے **Sahar Aik Istiara Hai**
مصنفہ	....	عمیرہ احمد **Umera Ahmed**
ناشر	....	گل فراز احمد علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	....	رفاقت علی
اشاعت اوّل	....	اپریل 2006ء
اشاعت دوم	....	جولائی 2010ء
قیمت	....	-/350 روپے

......ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرماویں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

انتساب!

(Murray) مرے کالج کے نام
جس نے مجھے شناخت دی
جہاں میں نے اپنی زندگی کے دو بہترین سال گزارے
جس سے مجھے محبت ہے

فہرست

❁	پیش لفظ	06
1-	مات ہونے تک	07
2-	سحر ایک استعارہ ہے	61
3-	کس جہاں کا زر لیا	87
4-	بات عمر بھر کی ہے	104
5-	دوسرا دوزخ	132



پیش لفظ......!

''سحرایک استعارہ ہے'' پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ چاروں کہانیاں First person narrative ہیں۔

میری ذاتی رائے میں First person میں لکھنا آپ کو جتنی آزادی دیتا ہے وہ کسی اور طرح سے ممکن نہیں۔ کردار کے ساتھ رہنے کی بجائے اس کے اندر بیٹھ کر لکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے...... بعض لوگوں کا خیال ہے یہ زیادہ مشکل ہوتا ہے...... مگر مجھے First person میں لکھنے میں جتنا مزہ آتا ہے وہ Third person کے طور پر نہیں۔

مختلف سالوں میں لکھی گئی یہ چار کہانیاں میرے ایسے ہی تجربے کا ایک حصہ ہیں...... ان کے بارے میں میری رائے محفوظ ہے...... آپ کی کیا رائے ہے؟ یقیناً اہمیت اسی کی ہے......

میری ہر تحریر کی طرح ان چاروں تحریروں میں بھی آپ کو کچھ خامیاں نظر آئیں گی (شاید بہت سی) اور میری زندگی کی ہر تحریر میں آپ کو کچھ خامیاں ضرور ملیں گی...... کیوں؟...... پتہ نہیں...... کب تک؟ جب تک ''زندگی'' خود خامیوں سے مبرا نہیں ہو جاتی کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ہاں...... نہیں...... شاید اور اگر ''زندگی'' نے خود کو پرفیکٹ کرنے کے لیے اپنی خامیوں کو دور کرنا شروع کر دیا تو بہت سی دوسری چیزوں اور لوگوں کی طرح **عمیرہ احمد** اور اس کی تحریریں بھی ختم ہو جائیں گی...... پھر آپ کو میری بجائے کسی پرفیکٹ رائٹر کو پڑھنا پڑے گا۔

عمیرہ احمد
umeraahmed@yahoo.com

مات ہونے تک

بعض باتیں آپ کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں، جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے فاطمہ کی کہی ہوئی ایک بات نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ویسے یہ صرف آج کی بات نہیں ہے، وہ جب بھی یہ جملے بولتی ہے، مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے مگر میں بے حد کوشش کر کے اپنی ہنسی پر قابو پا لیتا ہوں اور جب وہ میرے پاس سے چلی جاتی ہے تو پھر میں بے ساختہ ہنس پڑتا ہوں۔ جیسے ابھی ہنس رہا ہوں۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ فاطمہ کون ہے اور وہ ایسا کیا کہہ دیتی ہے جو مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اگر اس کی کوئی بات مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے تو پھر میں اس کے سامنے کیوں نہیں ہنستا، بعد میں کیوں ہنستا ہوں۔

فاطمہ میری بیوی ہے۔ ہماری شادی کو پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ ہماری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ آج کے زمانے کے تمام تقاضوں کے اعتبار سے ہم ایک آئیڈیل زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں...... نہیں، میرا خیال ہے، اس جملے میں کچھ تصحیح کی ضرورت ہے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ میری احسان مند بھی ہے۔ اس حد تک احسان مند ہے کہ اگر میں آج اس سے کہوں کہ وہ میرے لیے ایک بلند عمارت کی دسویں منزل پر سے کود جائے تو وہ کوئی سوال کیے بغیر کود جائے گی۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیا وہ واقعی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے؟ تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ میری احسان مند بھی ہے اور اگر وہ اس طرح میرے کہنے پر جان دے دے گی تو اس کی بنیادی وجہ وہ احسان ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے، آخر میں نے اس پر ایسا کون سا احسان کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے آپ کو کچھ اور سوالوں کے جواب بھی تو چاہئیں۔ یاد نہیں، آپ کو وہی بات جو مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں کیا کروں۔ پہلے آپ کو ہنسنے والی بات بتاؤں یا پھر یہ احسان والی...... خیر چلئے، بات وہیں سے شروع کرتے ہیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے فاطمہ چائے کا کپ لے کر میرے کمرے میں آئی۔ میں اس وقت اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے چائے کا کپ مجھے تھما دیا پھر خود بھی میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اخبار کی اہم خبروں کے بارے میں اس سے بات کرنے لگا۔ وہ اپنے ریمارکس دینے لگی پھر باتوں باتوں میں ہی ایک خبر پر اس نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

''خیر اس میں تو کوئی شک نہیں کہ عورت مرد سے زیادہ عقل مند ہوتی ہے۔''

ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر میرا دل بے اختیار ہنسنے کو چاہا مگر میں نے ہمیشہ ہی کی طرح اپنی ہنسی پر قابو پایا اور اسے بہت غور سے دیکھا، وہ

آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی آج سے پندرہ سال پہلے تھی۔ بعض چیزوں اور چہروں کا وقت کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ بھی ایسا ہی ایک چہرہ ہے۔ میں بہت دیر تک اخبار بھول کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اپنے ناخنوں کو File سے رگڑ رہی تھی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا، وہ کسی نہ کسی بات میں یہ جملہ دہراتی اور میں اس کا چہرہ دیکھنا شروع ہو جاتا پھر مجھے پندرہ سال پہلے ہونے والے سارے واقعات یاد آنے لگتے اور مجھے اپنے آپ پر فخر ہونے لگتا مگر ساتھ ہی مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا بھی بہت مشکل ہو جاتا۔ ایسے لمحات میں وہ اٹھ کر میرے پاس سے چلی جاتی اور پھر میں بے اختیار ہنستا چلا جاتا۔ آخر اس بات پر کیوں نہ ہنسا جائے کہ عورت جیسی مخلوق اپنے آپ کو مرد سے...... ہاں...... ''مرد'' سے زیادہ عقل مند سمجھتی ہے۔ میں جانتا ہوں اگر آپ مرد ہیں تو آپ خود بھی اس وقت میری بات پر سر ہلاتے ہوئے ہنس نہیں تو مسکرا ضرور رہے ہوں گے اور اگر آپ عورت ہیں تو یقیناً اس وقت آپ کی ساری ہمدردیاں فاطمہ کے ساتھ ہوں گی اور شاید نہیں بلکہ...... یقیناً آپ مجھے ملامت کر رہی ہوں گی اور سوچ رہی ہوں گی کہ میں بھی وہی روایتی سا مرد ہوں، وہی میل شاؤنزم کا شکار ایک بندہ۔ خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں قطعاً بھی کسی قسم کے شاؤنزم کا شکار نہیں ہوں مگر اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ عورت کسی بھی طرح مرد سے عقل مند نہیں ہو سکتی، چاہے، وہ کچھ بھی کر لے اور پھر فاطمہ...... وہ تو کبھی بھی عقل مندی کا دعویٰ نہیں کر سکتی مگر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اکثر یہ بات دہراتی رہتی ہے اور وہ بھی بڑے فخریہ انداز میں۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ چونکہ میں فاطمہ کا شوہر ہوں اس لیے کبھی بھی اپنی بیوی کو خود سے بہتر نہیں سمجھ سکتا۔ ایک مشرقی شوہر کی یہ سب سے بڑی خاصیت سمجھی جاتی ہے۔ آپ اب بھی غلط سمجھ رہے ہیں، میں قطعاً بھی اپنی بیوی کو خود سے کم تر سمجھنے کا قائل نہیں ہوں مگر جب بیوی اس قسم کے احمقانہ بیانات دیتی پھرے، وہ بھی اس صورت میں جب پچھلے پندرہ سال سے میرا اور اس کا ساتھ ہی مرد کی روایتی ذہانت کا ایک واضح ثبوت ہے مگر وہ حقیقت نہیں جانتی ورنہ شاید پچھلے پندرہ سال میں ایک بار بھی یہ اعلان نہ کرتی کہ عورت مرد سے زیادہ عقل مند ہے۔ بالکل اسی طرح آپ لوگ حقیقت سے لاعلم ہیں۔ ورنہ شاید آپ اس وقت میری ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے۔ چلیں، ایسا کرتے ہیں کہ میں اپنا کیس آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں، سارے Facts and figures کے ساتھ اور پھر آپ لوگ ہی فیصلہ کیجئے گا کہ کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مرد عورت سے زیادہ عقل مند ہے اور عورت کبھی بھی اس کے حربوں اور ہتھکنڈوں کو سمجھ سکتی ہے، نہ اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ دیکھیں جو بھی فیصلہ دیجئے گا بہت دیانت داری سے دیجئے گا۔ خاص طور پر اگر آپ ایک عورت ہیں تو عورتوں کے اس روایتی تعصب سے بالاتر ہو کر اپنی رائے کا اظہار کیجئے گا۔

✡......✪......✡

فاطمہ میرے سب سے چھوٹے چچا کی بیٹی تھی۔ چار بہنوں اور ایک بھائی میں سب سے بڑی۔ ہم سب لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے۔ میرے والد سب سے بڑے تھے، ان کا سرامکس کا بزنس تھا۔ آہستہ آہستہ یہ بزنس اتنا اچھا ہو گیا کہ میرے والدین کو اب باقی لوگوں کے ساتھ رہنا مشکل لگنے لگا، چنانچہ جلد ہی ہم لوگ الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ صرف گھر تبدیل نہیں ہوا بلکہ ہمارا معیار زندگی بھی بدل گیا۔ گھر میں گاڑی آ گئی۔ ہم لوگوں کو شہر کے سب سے اچھے سکولوں میں سے ایک میں داخل کروا دیا گیا اور ہاں، صرف یہ سب کچھ ہی نہیں بدلا، ہم لوگوں کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ بھئی، آپ تو جانتے ہی ہیں، دولت آنے کے بعد یہ تبدیلی تو ناگزیر ہو جاتی ہے۔ آفٹر آل آپ کے رویے سے بھی تو پتا چلنا چاہیے

کہ آپ کے پاس ''کیا'' ہے اور ''کتنا'' ہے۔ شروع میں ہمارے والدین نے ہمیں اس ''تبدیلی'' کے بارے میں ''بنیادی'' باتوں سے آگاہ کیا۔ بعد میں ہم نے ان باتوں کو اپنے کمال پر پہنچادیا۔ اس زمانے میں کوئی ہم سے ملتا تو اسے لگتا، جیسے شہر میں صرف ہم ہی ''امیر'' ہیں۔

ہاں، میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ ہم لوگ اپنے چچاؤں وغیرہ سے کافی کم ہی ملا کرتے تھے۔ اصل میں غریب رشتے داروں سے ملنے میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ مانگتے ہی رہتے ہیں۔ ہمیشہ ان کی زبان پر کوئی نہ کوئی فرمائش ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ امیر رشتے داروں کے گھر آتے ہوئے خاص طور پر اپنی جھولیاں پھیلائے ہی رکھتے ہیں تاکہ کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے۔ یہ آخری والا جملہ اگر آپ کو نامناسب لگ رہا ہے تو میں آپ پر واضح کردوں کہ یہ میرا نہیں، میری امی کا فرمایا ہوا جملہ ہے جو وہ اکثر کہتی رہتی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ماں کی دعا جنت کی ہوا ہوتی ہے اور میرے لیے تو ماں کا فرمانا بھی جنت کی ہوا سے کم نہیں تھا۔

میرا خیال ہے، ابھی میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے علاوہ ان کی تین بیٹیاں تھیں اور وہ تینوں مجھ سے بڑی تھیں۔ اکلوتا بیٹا آپ جانتے ہی ہیں، کیا چیز ہوتا ہے، خاص طور پر جبکہ والدین امیر بھی ہوں۔ میری پرورش ان تمام آزمودہ طریقوں سے کی گئی تھی جو پچھلے کئی سالوں سے اکلوتے بیٹوں کو بگاڑنے کے لیے کارگر تھے۔ اب کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میں دن کو اگر رات کہتا تو میرے والدین کے لیے وہ رات ہی ہوتی مگر خود میں دن کو کبھی رات نہیں سمجھتا تھا۔ خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری تیوری کے بلوں سے بچنے کے لیے وہ خاصی کوشش کیا کرتے تھے اور میں یہ کوشش اکثر ناکام کردیا کرتا تھا۔ اس خاص قسم کے لاڈ پیار کا نتیجہ وہی ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔ میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوگیا۔ میں نے بمشکل گریجویشن کیا حالانکہ میرے والد صاحب مجھے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھجوانے پر تلے ہوئے تھے۔ اگرچہ میں نے شروع سے ہی ان پر واضح کردیا تھا کہ میں گریجویشن سے زیادہ کی اہلیت نہیں رکھتا مگر انھیں کبھی میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بالآخر ہر امتحان میں پاس ہو ہی جایا کرتا تھا چاہے وہ مڈل ہو یا میٹرک یا پھر ایف اے میں کسی نہ کسی طرح پاس ہو ہی جایا کرتا تھا۔ اب آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ کسی نہ کسی طرح سے میری کیا مراد ہے۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایف اے تک انھیں میری باتوں پر بالکل یقین نہیں آیا مگر بی اے میں پہلی بار جب میں نے سپلی لی تو انھیں پہلی بار اس بات پر اعتبار آیا کہ ان کا بیٹا کافی خود شناس ہے۔ لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں، انھوں نے ایک بار بھی اپنی چھٹی حس پر اعتبار کرنا گوارا نہیں سمجھا۔ آپ تو جانتے ہیں، پرانی نسل نئی نسل پر اتنی جلدی اعتبار نہیں کرتی۔ خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میری سپلی کے بارے میں جاننے کے بعد انھوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا، میری بہت ہمت بندھائی۔ اب یہ اور بات ہے کہ مجھے ان دونوں ہی چیزوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اپنی ناکامی سے مجھے کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔

انھوں نے کہا تھا۔ ''تم فکر نہ کرو بی، اے میں تو پہلی بار بڑے بڑے فیل ہوجاتے ہیں۔ تم دوبارہ تیاری کرو، انشاء اللہ تعالیٰ اس بار تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔''

آپ یقین کیجیے مجھے بی اے میں ناکامی نے اتنا ڈپریس نہیں کیا تھا، جتنا ان کے ان الفاظ نے کیا تھا۔ مجھے بی، اے کے کورس کی کتابیں سانپ بن کر اپنے آگے پیچھے لہراتی نظر آنے لگیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، میرے جیسا بندہ جس کے لیے کوئی کتاب پہلی بار پڑھنا بہت تکلیف دہ

عمل ہوتا ہے دوسری بار تو یقیناً یہ موت ہوتا ہے۔ آپ خود بتائیں آپ میں سے کتنے ہیں جو پورے دو سال کورس کی کتابیں پڑھیں پھر اس میں فیل ہو جائیں اور آپ سے دوبارہ انہی کتابوں کو پڑھنے کے لیے کہا جائے تو پھر کیا آپ کی Feelings مجھ سے مختلف ہوں گی۔

خیر میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے والد کو سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ دوسری بار بھی مجھ میں اپنے پہلے "عمل" کو دہرانے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اور نمبر کم تو ہو سکتے ہیں مگر کسی طور پر بھی ان کے بڑھنے کی کوئی امید نہیں ہے لیکن میرے والد اور والدہ کو میری علمی صلاحیتوں سے زیادہ اپنے وظائف اور تعویذ گنڈوں پر اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اگلی بار کوئی نہ کوئی غیبی طاقت نتیجہ بدل کر رکھ دے گی آپ یقین کریں یا نہ کریں، اگلی بار واقعی اس غیبی طاقت نے نتیجہ بدل کر رکھ دیا۔ میں ایک کے بجائے دو مضامین میں فیل ہوا۔ مجھے کوئی شاک نہیں لگا کیونکہ میری غیبی طاقت نے مجھے پہلے ہی اس رزلٹ سے آگاہ کر دیا تھا مگر میرے والدین کافی پریشان ہوئے۔ انھیں دکھ تھا کہ میری راتوں کی محنت کوئی رنگ نہیں لائی۔ مجھے بھی اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ ان کی راتوں کی محنت بھی کوئی رنگ نہیں لائی کیونکہ میں رات کو دل لگا کر پڑھتا تھا یا نہیں مگر وہ دل لگا کر میرے لیے راتوں کو وظیفے ضرور کرتے تھے۔

اصل قیامت مجھ پر تب ٹوٹی، جب مجھے ایک بار پھر کوشش کرنے کے لیے کہا گیا۔ دیکھیں اگرچہ بی اے میں دوبارہ فیل ہونا اور وہ بھی بغیر کسی محنت کے ایک انتہائی دلچسپ اور سکون بخش کام ہے، اتنا ہی پُرمسرت اور سکون بخش جتنا انضمام الحق کے لیے صفر پر آؤٹ ہونا مگر آخر دو بار صفر پر آؤٹ ہونے کے بعد تیسری بار تو وہ بے چارہ بھی صفر پر آؤٹ نہ ہونے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی کوشش میں نے بھی کی تھی۔ تیسری بار میں نے بالآخر بی اے کا ماؤنٹ ایورسٹ تسخیر کر ہی لیا تھا اور یقین کیجیے، یہ جان کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی کہ بی اے میں میری تھرڈ ڈویژن نے میرے والدین کی ساری امیدوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے، ایک تھرڈ ڈویژنر کو کوئی بھی باہر کی یونیورسٹی قبول نہیں کرتی تھی کم از کم اس زمانے میں خیر تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میری دلی مراد پوری ہو گئی۔ مزید تعلیم سے مجھے چھٹکارا مل گیا۔ میرے والدین کو کچھ ہفتے تو اس بات کا خاصا صدمہ رہا مگر بالآخر انھیں بھی صبر آ گیا۔ میرے والد نے مجھے باقاعدہ طور پر اپنی فیکٹری جوائن کرنے کے لیے کہا اور میں نے ان کی یہ خواہش فوراً پوری کر دی۔

میں نے ان کے کہنے کے اگلے ہی دن فیکٹری جانا شروع کر دیا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں، اگرچہ میں ایک بگڑی ہوئی اولاد تھا مگر مجھے اپنے باپ کے کاروبار میں بہت دلچسپی تھی اور میں شروع سے ہی یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ راغب کرنے کے بجائے بزنس میں حصہ لینے دیں۔

فیکٹری جوائن کرنے کے ابتدائی چند مہینوں میں ہی میرے والد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اتنا نکما بھی نہیں تھا، جتنا ان کا اندازہ تھا۔ کم از کم بزنس کے معاملے میں اچھا خاصا تھا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ بزنس کرنے کے لیے اگرچہ آپ کو اس بزنس سے متعلقہ تمام بنیادی باتوں کا علم ہونا چاہیے لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ وسیع قسم کے تعلقات ہیں۔ شاید میں نے ابھی آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میرے تعلقات خاصے وسیع تھے۔ جب آپ کے پاس دولت ہو اور خاصی ہو تو پھر آپ کے لیے اپنی ہی طرح کے دولت مند لوگوں سے میل جول بڑھانا

خاصا آسان ہو جاتا ہے اپنی ہی طرح کے لوگوں سے میری مراد نو دولتیا کلاس ہے مگر اس معاملے میں میرا ٹیسٹ بہت اچھا تھا۔ میں نے چن چن کر ایسے لوگوں سے میل جول بڑھایا جو خاندانی تھے اب آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ خاندانی سے ہمارے معاشرے میں کیا مراد لی جاتی ہے یعنی جو امیر ہیں لیکن میرے دوست صرف امیر ہی نہیں تھے، وہ بارسوخ خاندان سے بھی تعلق رکھتے تھے نتیجہ صاف ظاہر ہے، مجھے جب بھی اپنے بزنس کے سلسلے میں کسی مشکل یا دشواری کا سامنا کرنا پڑتا میں اپنے دوستوں کے اثر و رسوخ کا سہارا لیتا اور وہ مشکل منٹوں میں حل ہو جاتی اور اس کے بدلے میں میں اپنے دوستوں پر روپیہ خرچ کرتا رہتا۔ اب ظاہر ہے، یہ تو ضروری تھا۔ اس کے بغیر تو کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ آخر یہ Give and take کی دنیا ہے اگرچہ میں تو Take and give پر یقین رکھتا ہوں ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں نے بڑی کامیابی سے اپنے والد کی فیکٹری کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ وہ اس معاملے میں مجھ سے بہت خوش تھے۔

اگلے دو سالوں میں، میں نے اپنی فیکٹری کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ میرے انتظام سنبھالنے سے پہلے میرے والد سرامکس کی چیزیں صرف ملک کے اندر ہی سپلائی کرتے تھے، میں نے ان چیزوں کو ایکسپورٹ بھی کرنا شروع کر دیا۔ فیکٹری میں کام کرنے والی لیبر اگرچہ Skilled تھی لیکن میں نے باقاعدہ طور پر ان کی تربیت کے لیے مناسب انتظامات کیے چیزوں کی کوالٹی کو بہتر بنایا فیکٹری میں استعمال ہونے والی تقریباً ساری مشینری کو بدل ڈالا امپورٹڈ مشینری کی قیمت اور دوسرے اخراجات نے اگرچہ میرے والد کو کافی پریشان اور ناراض کیا مگر آخر میں جب انھوں نے ہر سال کے Net پروفٹ کو دیکھنا شروع کیا تو ان کی پریشانی بالکل غائب ہو گئی۔ میں نے فیکٹری سنبھالنے کے پہلے ہی سال اپنی فیکٹری کے پروفٹ کو دگنا کر دیا تھا اور ظاہر ہے، لمبے چوڑے اخراجات کے باوجود بھی اگر منافع دگنا ہو گیا تھا تو میرے والد اس بات پر مجھ سے زیادہ دیر تک تو ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔

میں جانتا ہوں، اب آپ میرے ان کارناموں کی تفصیل سن سن کر تنگ آ گئے ہوں گے یقیناً میرا مقصد آپ کو اپنی صلاحیتوں سے متاثر کرنا نہیں تھا، میں نے آپ کو صرف یہ بتایا تھا کہ میں کچھ ایسا بھی ناکارہ بندہ نہیں تھا، تعلیم میں نہ سہی لیکن بزنس میں ضرور Exceptional تھا اور اس میدان میں میری ان خاص قسم کی کامیابیوں نے خاندان میں میرا ایک خاص مقام بنا دیا تھا۔ ہاں ایک بات واضح کر دوں کہ خاندان سے میری مراد اپنے ماں باپ اور بہنیں وغیرہ نہیں ہیں کیونکہ ان کی نظروں میں تو ایسے کارنامے کے بغیر ہی میرا مقام خاصا بلند تھا اور ہمیشہ رہتا۔ خاندان سے میری مراد اپنے چچاؤں اور ان کے گھر والوں سے ہے۔ ان دنوں خاندان میں ہر ایک کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ غریب لوگ اپنے امیر رشتے داروں کی اولاد پر کس طرح گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اگر آپ کو ایک بار پھر یہ جملہ نامناسب یا قابل اعتراض لگا ہے تو میں ایک بار پھر آپ پر یہ واضح کر دینا چاہوں گا کہ یہ جملہ میری امی کا فرمایا ہوا ہے اور آئندہ بھی جو جملہ آپ کو بہت قابل اعتراض یا نامناسب لگے تو آپ یہ جان لیجئے کہ وہ میری امی ہی کا ہوگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ماؤں کی ذمے داریاں دہری تہری ہوتی ہیں انھیں نہ صرف اولاد کی پرورش کرنا ہوتا ہے۔ بلکہ انھیں غریب رشتہ داروں کی کمینگی کے بارے میں بتانا ہوتا ہے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری امی نے بڑی صفائی مہارت اور کامیابی سے بچپن میں ہی ہم بھائی بہنوں کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ ہم بہن بھائی اپنے دوسرے کزنز سے بہت مختلف ہیں کیونکہ ہمارے پاس

روپیہ ہے اور ہمارے کزنز کسی بھی طرح ہمارے مقابل نہیں آسکتے اس لیے ہمیں ان کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے تاکہ انھیں یہ بات یاد رہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان بہت کچھ مختلف ہے۔ اب آپ جانتے ہی ہیں، جب آپ کی پرورش اس طرح کے سنہری اصولوں کے مطابق ہوئی ہو تو واقعی آپ دوسرے لوگوں سے میرا مطلب ہے، عام لوگوں سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ اب براہ مہربانی مجھ سے یہ مت پوچھئے گا کہ عام لوگوں سے میری کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے، میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جن کے پاس پیسہ نہیں ہوتا اور ایسے لوگوں میں میرے ددھیال کا بھی شمار ہوتا تھا۔ اچھا ویسے یہ بھی نہیں تھا کہ وہ سب لوگ بہت ہی غریب تھے۔ وہ سب ایک بڑی حویلی میں رہتے تھے، اچھا کھاتے اچھا پہنتے تھے۔ میرے تینوں چچا مختلف سرکاری محکموں میں ملازم تھے اور بدقسمتی سے انھیں ایمان داری کی بیماری بھی تھی پھر ظاہر ہے، ایسے حالات میں ترقی کے مواقع کیسے مل سکتے ہیں، خوش قسمتی سے میرے والد نے سرکاری ملازمت نہیں کی، ان کا رجحان شروع سے ہی بزنس کی طرف تھا۔ شروع میں انھیں کافی محنت کرنی پڑی لیکن پھر جب انھوں نے دو+ دو= گیارہ بنانے کا فارمولا سیکھ لیا تو ان کے تمام مسائل حل ہو گئے۔ نہ صرف کاروبار اچھا ہو گیا بلکہ ان کی مالی حیثیت بھی اپنے بھائیوں سے بہت بہتر ہو گئی۔ خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میرے چچا کچھ ایسے بھی غریب نہ تھے مگر بہر حال وہ ہمارے مقابلے میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ حویلی سے ایک الگ گھر میں شفٹ ہونے کے بعد شروع شروع میں ہمارا حویلی میں آنا جانا رہا لیکن پھر جوں جوں ہمارا کاروبار ترقی کرتا گیا، یہ میل جول آہستہ آہستہ تقریباً ختم ہوتا گیا اور پھر نوبت یہاں تک آگئی کہ ہم لوگ باقی خاندان والوں سے کسی شادی یا کسی دوسری تقریب میں ہی ملتے تھے۔

ہمارے خاندان میں عام طور پر ساری شادیاں خاندان کے اندر ہی کرتے ہیں لیکن میرے والدین نے اس رسم کو بھی توڑ ڈالا۔ خاندان کے مختلف لوگوں کے اصرار کے باوجود انھوں نے میری تینوں بہنوں کی شادی خاندان کے باہر کیں اور آپ جانتے ہی ہوں گے، اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ جی بالکل، آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ روپیہ، شاید میرے والد تو کبھی بھی خاندان سے باہر شادی کرنے پر تیار نہ ہوتے لیکن میری امی نے خاندان کے اندر میری بہنوں کی ممکنہ شادی کے بعد ان کے ہولناک مستقبل کی اتنی دلدوز تصویریں کھینچیں کہ بالآخر میرے والد صاحب میری تینوں بہنوں کی شادی خاندان سے باہر کرنے پر تیار ہو گئے۔ اب خاندان والوں کی بدقسمتی کہہ لیجیے یا میری بہنوں کی خوش قسمتی کہ ان تینوں کے رشتے بہت ہی اچھے خاندانوں میں ہو گئے اور نہ صرف وہ ہم سے بھی اعلیٰ خاندانوں میں گئیں بلکہ وہ وہاں بہت خوش بھی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں اگر روپیہ روپے کو کھینچتا ہے تو اچھا خاندان اچھے خاندان کو۔ خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اپنے خاندان سے جن بہت سی وجوہات کی بناء پر ہم تقریباً کٹ کر رہ گئے تھے، اس میں میری بہنوں کی شادی بھی تھی۔

میرے چچاؤں نے اور کسی معاملے میں میرے والد سے برتری حاصل کی یا نہیں، بہر حال ایک معاملے میں ان کی سبقت مصدق تھی ان تینوں کی اولادیں تعلیم کے معاملے میں ہم لوگوں سے بہت آگے تھیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، غریب لڑکے اکثر پڑھائی میں تیز ہوتے ہیں اور آپ کو یہ بھی علم ہو گا کہ یہ پڑھائی وغیرہ کا کام بھی بے کار لوگوں کو ہی سجتا ہے اور غریبوں سے زیادہ بیکار اور کون ہو سکتا ہے۔ امیروں کو تو اور بہتیرے کام ہوتے ہیں۔ دیکھیں ناراض نہ ہوں، میں جانتا ہوں، یہ کچھ زیادہ اچھے ریمارکس نہیں ہیں مگر میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ آپ کو میرا کوئی تبصرہ برا لگے تو یاد

رکھیے، وہ میرے نہیں میری امی کے الفاظ ہوں گے۔ یہ الفاظ بھی میری امی کے ہی ہیں جو انھوں نے میرے چچا کے سب سے بڑے بیٹے احتشام کے ایم۔اے اکنامکس میں ٹاپ کرنے پر کہے تھے۔ ہو سکتا ہے، اس وقت آپ میری امی کو بہت ناپسند کر رہے ہوں لیکن میری امی کچھ ایسی بری خاتون بھی نہیں ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ ان دنوں میری امی کے زخم ہرے تھے، اس کی وجہ میری گریجویشن میں تھرڈ ڈویژن تھی۔ ظاہر ہے، کوئی بھی محبت کرنے والی ماں اس موقع پر اپنی اولاد کی ہزیمت کیسے برداشت کر سکتی ہے، یقیناً وہ اسی قسم کے تبصرے کریں گی۔

امی نے اس موقع پر اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر بہر حال اب یہ موقع زیادہ تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ احتشام صاحب کے اس گولڈ میڈل کی وجہ سے کئی دنوں تک میرے والدین کی راتوں کی نیندیں اڑی رہیں۔ لیکن مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دو ماہ بعد جب وہ یہ صدمہ بھلانے کے قابل ہوئے تو انھیں اور شاک یہ جان کر لگا کہ اسے ایک بنک میں بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ میری امی نے اس موقع پر بھی بہت کچھ کہا تھا مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے، میں اتنی معمولی باتوں پر کس طرح اس سے جیلس ہوتا یا دکھی ہوتا۔ دکھ اور جیلسی تو مجھے تب بھی نہیں ہوئی تھی، جب اس کی منگنی فاطمہ سے ہوگئی تھی۔ تین ماہ کے دوران میں اس کے گھر سے مٹھائی کا تیسرا ڈبا آیا تھا۔ اس بار امی کا صدمہ سب سے زیادہ تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر انھیں اس بات پر غصہ کیوں آرہا ہے کہ منجھلے چچا نے اپنے بیٹے کی منگنی چھوٹے چچا کی بیٹی سے کر دی تھی۔ امی کئی دنوں تک اس بات پر بھڑکتی رہی تھیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے منجھلے اور چھوٹے چچا اور ان کی اولادوں اور بیویوں کو کچھ نہ کچھ سناتی رہیں۔ اس غصے کی وجہ مجھے چند ماہ بعد اتفاقاً انہی کی زبانی پتا چلی تھی۔

اصل میں میری خالہ نے احتشام کے ٹاپ کرنے پر میری امی سے کہا تھا کہ وہ ان کی بیٹی کے لیے احتشام کے والد یعنی میرے چچا سے بات کریں۔ امی نے اس سلسلے میں ان سے بات کی تھی مگر منجھلے چچا نے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ خاندان میں لڑکیوں کے ہوتے ہوئے وہ خاندان سے باہر کبھی نہیں جائیں گے اور ویسے بھی احتشام شروع سے ہی فاطمہ کو پسند کرتا تھا اس لیے کہیں اور رشتہ کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ امی کو منجھلے چچا سے اس قسم کے کورے جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے ان کا غصہ کچھ اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ ناراضگی انھیں صرف منجھلے چچا سے نہیں تھی بلکہ سب سے چھوٹے چچا سے بھی تھی کیونکہ انھوں نے بھی میری امی کی خواہش جاننے کے باوجود منجھلے چچا کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی نسبت طے کر دی تھی۔ اب ظاہر ہے، ایسی باتوں پر میری امی چراغ پا نہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔ کچھ بھی تھا، وہ اس خاندان کے بڑوں میں سے تھیں لیکن پھر بھی ان کی بات کو اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ خیر چند ماہ امی کا پارا آسمان پر رہا پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی گئیں۔

میں احتشام اور فاطمہ دونوں سے ذاتی طور پر زیادہ واقف تھا۔ ان سے ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی اور وہ بھی سلام دعا سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی۔ احتشام ویسے بھی مجھے تقریبات میں کم ہی نظر آتا تھا۔ جہاں تک فاطمہ کا تعلق تھا تو اس سے بھی میری شناسائی بہت محدود سی تھی۔ وہ ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی، کو ایجوکیشن میں اور یہ بات مجھے ویسے ہی ناپسند تھی۔ خاندان کی باقی لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں لیکن کسی نے بھی یونیورسٹی تک جانے کی ہمت نہیں کی تھی اور یہ ہمت اگر کسی نے کی بھی تو صرف فاطمہ نے اور یقیناً چھوٹے چچا کی شہ پر۔ میں ان دنوں تعلیم یافتہ لڑکیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا تھا اور خاص طور پر کو ایجوکیشن میں پڑھنے والی لڑکیوں کو۔ آپ خود ہی بتائیں، آخر لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی کیا

ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے، تھوڑا بہت پڑھ لیں، جتنا ضروری ہے لیکن لمبی چوڑی ڈگریوں کی انھیں کیا ضرورت ہے؟ کیا میں یہاں وہی جملہ دہراؤں کہ آخر کو تو انھیں ہانڈی چولہا ہی...... خیر اگر وہ تعلیم حاصل کرنا ہی چاہتی ہیں تو پھر کوایجوکیشن میں پڑھنا تو خاصا نامناسب کام ہے۔

فاطمہ کا یونیورسٹی میں داخلہ لینا، ہماری خاندانی روایات سے کھلم کھلا انحراف تھا اور اس بات پر میری امی اور ابو نے کافی اعتراضات بھی کیے تھے مگر کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا۔ چھوٹے چچا نے خاموشی سے ان کی باتیں سنیں اور بس۔ بہرحال فاطمہ کے بارے میں میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اور یہی حال میرے گھر والوں کا تھا۔ خاص طور پر امی کبھی بھی اس کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کرتی تھیں۔

زندگی میں کچھ واقعات بڑے عجیب ہوتے ہیں اور وہ واقعات زندگی میں بہت اہم بھی ہوتے ہیں۔ اب پتا نہیں، وہ عجیب ہونے کی وجہ سے اہم ہوتے ہیں یا اہم ہونے کی وجہ سے عجیب۔ محبت بھی ایک ایسا ہی عجیب واقعہ ہوتا ہے اگرچہ میں تعلیمی میدان میں کچھ زیادہ نمایاں نہیں تھا مگر اس ایک خامی کے علاوہ میرے اندر کوئی دوسری خامی نہیں پائی جاتی تھی۔ میں کسی بری صحبت کا بھی شکار نہیں تھا اگرچہ روپیہ خرچ کرنا پسند کرتا تھا مگر بہرحال اس کو اندھا دھند نہیں لٹاتا تھا، خاص طور پر فیکٹری سنبھالنے کے بعد اور آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن یہ صحیح ہے کہ مجھے کسی زمانے میں بھی لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ عشق و محبت تو بڑے دور کی بات تھی۔ اس اعتبار سے آپ مجھے ایک اچھے کردار کا بندہ کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں لڑکیوں کے بارے میں اس عدم دلچسپی کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی شاید یہ تھی کہ مجھے شروع سے ہی کچھ دوسری چیزوں کا جنون کی حد تک شوق رہا تھا، مثلاً سیر و تفریح، سپورٹس اور شاپنگ اور یہ صرف میرے شوق نہیں تھے، میرے جنون تھے۔ جب آپ زندگی اس طرح کی سرگرمیوں میں گزارتے رہے ہوں تو پھر کسی اور سرگرمی کا خیال ذرا مشکل سے ہی ذہن میں آتا ہے۔ جب ان سرگرمیوں سے فراغت نصیب ہوتی تو پھر والدین کو خوش کرنے کے لیے کتابیں اٹھائے پھرتا میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ انھیں شروع سے ہی مجھے بیرون ملک تعلیم دلوانے کا بہت شوق رہا تھا اور اس شوق نے میری زندگی کو خاصا محدود کر دیا تھا۔ جب تعلیم سے فارغ ہوا تو پھر فیکٹری کی ذمے داری کندھوں پر آ گئی۔ اس میں تبدیلیاں لانے میں میرے باقی شوق یا جنون بھی کم ہو گئے۔ ہمیشہ کے لیے نہ سہی مگر فیکٹری سنبھالنے کے دو تین سال بعد تک میں نے فیکٹری کے سوا اور کوئی مصروفیت نہیں پالی۔ فیکٹری ان دنوں میرے حواس پر سوار تھی اور ظاہر ہے، اس طرح کی زندگی گزارنے والا بندہ عشق و محبت کے روگ کیسے پال سکتا ہے، سو ایک لمبے عرصے تک میں بھی ان تمام روگوں سے بچا رہا مگر آخر کب تک......

اس دن ابو نے مجھے کسی کام سے بڑے چچا کے پاس بھیجا تھا۔ چچا اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ چچی نے مجھے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ وہ بس آنے ہی والے ہیں، میں کچھ دیر انتظار کر لوں۔ میں نے کوشش کی کہ میں انتظار کرنے کے بجائے وہاں سے نکل آؤں لیکن میری کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ چچی نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے بیٹھنا ہی پڑا۔

وہ میرے لیے چائے کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئیں۔ میں اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہنے کے بجائے باہر لان کی طرف نکل گیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر میں دالان میں لگے ہوئے پودوں کو دیکھ رہا تھا اور تبھی میں نے چھوٹے چچا کے گھر والے حصے سے اسے نکلتے دیکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ بچپن یہیں ان لوگوں کے ساتھ کھیلتے گزارا تھا اور اب بھی کبھی کبھار کسی تقریب میں اس پر نظر پڑ ہی جاتی

تھی مگر پتا نہیں، اس دن وہ مجھے اتنی مختلف کیوں لگی۔ شاید اس کی وجہ وہ مختلف قسم کی باتیں اور تاثرات تھے جو میں اپنے گھر والوں سے اس کے بارے میں سنتا اور سوچتا رہا تھا۔ لاشعوری طور پر میں اس کو دیکھتا رہا۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خاصی دراز قد تھی۔ سیاہ قمیض اور سفید شلوار میں ملبوس سفید دوپٹہ بے پروائی سے گلے میں ڈالے ہوئے کندھوں سے نیچے تک لٹکتے ہوئے سیاہ چمک دار بالوں کو ہیئر بینڈ میں لپیٹے ہوئے وہ منجھلے چچا کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا اور پتا نہیں کیوں لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس وقت میری طرف متوجہ ہو۔ بعض لمحے قبولیت کے ہوتے ہیں۔ شاید وہ لمحہ بھی تھا۔ منجھلے چچا کے برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک سرسری نظر بڑے چچا کے حصے کی طرف ڈالی تھی اور پھر اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ شاید یہ فیصلہ کرتی رہی تھی کہ اسے میری طرف آنا چاہیے یا نہیں لیکن پھر وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن بے اختیار میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ اب اپنے کندھوں پر پھیلا لیا تھا۔

''السلام علیکم، کیسے ہیں آپ؟'' وہ بالکل میرے سامنے آ کر رک گئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟'' میں نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ اکیلے آئے ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''ہاں اکیلا ہی آیا ہوں، اصل میں ابو نے بھیجا ہے، بڑے چچا کے پاس ایک کام کے سلسلے میں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''بڑے چچا تو ابھی شاید آفس سے واپس نہیں آئے ہوں گے۔''

''ہاں، چچی کہہ رہی ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ میں انہی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس سے باتیں کرتا رہوں۔

''ٹھیک ہے۔ آپ انتظار کریں، مجھے ذرا منجھلے چچا کی طرف کام ہے۔'' اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا اور پھر واپس مڑنے لگی۔

''آپ آئیں نہ کبھی ہماری طرف۔'' وہ میری بات پر مڑتے مڑتے رک گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر یک دم حیرانی دیکھی پھر لمحوں میں وہ نارمل ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟'' میں اس کی بات پر گڑبڑا گیا۔

''مطلب؟''

''اصل میں آپ لوگوں کی طرف سے ہمیں صرف کسی شادی پر ہی بلایا جاتا ہے اور اب اپنے گھر میں صرف آپ ہی بچے ہیں تو میں نے سوچا شاید......'' فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے گھر آنے کے لیے کم از کم آپ لوگوں کو کسی تقریب کی ضرورت نہیں ہے۔ جب آپ کا دل چاہے، آپ آ جائیں۔'' میں نے بالآخر اپنی شرمندگی پر قابو پا لیا تھا۔

''چلیں ٹھیک ہے، اب آپ نے انوائٹ کیا ہے تو ضرور آئیں گے۔'' میں نے اسے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر وہ مڑ کر منجھلے چچا کے گھر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں اس وقت تک اسے دیکھتا رہا، جب تک وہ دروازہ بند کر کے میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ ضروری نہیں ہوتا کہ اگر انسان نظروں سے اوجھل ہو جائے تو ذہن سے بھی اوجھل ہو جائے جس طرح اس دن وہ میرے ذہن سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

پہلی بار میں کسی صنف مخالف سے متاثر ہوا تھا اور پہلی بار ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔

خوبصورتی کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک خوبصورتی وہ ہوتی ہے جو آپ کو بے اختیار کچھ کہنے پر مجبور کر دے۔ ایک خوبصورتی وہ ہوتی ہے جو اس وقت آپ کو مسحور کر دے مگر بعد میں آپ اسے بیان کر سکیں مگر ایک خوبصورتی وہ ہوتی ہے جو ہمیشہ آپ کو مسحور کیے رکھتی ہے، نہ آپ اس وقت کچھ کہہ پاتے ہیں، نہ بعد میں ہی اس کو بیان کر پاتے ہیں۔ ایسی خوبصورتی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی، اندر کہیں کسی چیز پر جا کر لگتی ہے اس طرح کہ بعد میں بندہ کسی قابل ہی نہیں رہتا، جیسے اس دن میرے ساتھ ہوا تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں

اسیر حسن تھا یا تھا مقید شہر
کوئی تو بات تھی ایسی کہیں گیا نہ گیا

بہر حال اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ چوتھے ہی دن میں بغیر کسی ارادی کوشش کے سب سے چھوٹے چچا کے گھر موجود تھا۔ میری وہاں آمد سب کے لیے بے حد حیران کن تھی۔ میں دوپہر کو وہاں گیا تھا اور شام کو وہاں سے واپس آیا، وہ بھی اس لیے کہ فاطمہ کو اپنے کسی ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی اور وہ معذرت کر کے شام کو اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ظاہر ہے، اس کے بعد میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔

پہلی دفعہ ان دنوں میری سمجھ میں یہ آیا تھا کہ اگر بندے کو محبت میرا مطلب ہے، واقعی محبت ہو جائے تو پھر اس کا دل کسی اور چیز میں کیوں نہیں لگتا۔ ان دنوں اٹھتے بیٹھتے اگر کوئی چہرہ میرے سامنے رہتا تھا تو وہ فاطمہ کا چہرہ تھا۔ اگر کوئی آواز کانوں میں گونجتی تھی تو وہ بھی اسی کی آواز تھی۔ جتنی غلطیاں ان چند دنوں میں، میں نے فیکٹری میں کی تھیں، شاید پچھلے دو سال میں کبھی نہیں کی تھیں۔ مجھے حیرانی تھی کہ مجھے فاطمہ پہلے کبھی نظر کیوں نہیں آئی۔ پہلے کبھی مجھے اس سے محبت کیوں نہیں ہوئی۔ اب ہی یہ سب کچھ کیوں ہوا تھا مگر آپ کیا کر سکتے ہیں، بہت سی چیزیں زندگی میں بس ہو جاتی ہیں۔ کیوں، کب اور کیسے کی تو شاید کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

فاطمہ کے گھر جانے کے بعد میں پھر کسی طرح کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ اس سے میری ملاقات ہو جاتی یا کم از کم میں اسے دیکھ ہی لیتا۔ میں دوبارہ فاطمہ کے گھر نہیں گیا کیونکہ میرا اس طرح آنا جانا انھیں بہت عجیب لگتا۔ میں مہینوں میں کبھی وہاں کا ایک چکر لگایا کرتا تھا، وہ بھی کسی کام سے اور اب ایک ہی ہفتے کے بعد دوبارہ وہاں جانا سب کی نظروں میں کھٹکتا۔

اگلے ہفتے میں نے بہت اصرار کر کے اپنے گھر میں میلاد کروایا اور امی کو مجبور کیا کہ وہ تمام چچاؤں کو اس تقریب میں بلائیں۔ امی کو کچھ حیرت ہوئی تھی کہ اچانک مجھے میلاد کی کیا سوجھی اور پھر چچاؤں کے لیے اتنی محبت کہاں سے اُمڈ آئی۔ بہر حال انھوں نے ہامی بھر لی۔ تمام چچاؤں کو

دعوت دینے میں امی کے ساتھ خود گیا تھا۔ چھوٹے چچا کے گھر سے واپس آتے ہوئے میں کچھ لمحوں کے لیے رک گیا تھا اور میں نے اس سے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے، اب آپ ضرور ہمارے گھر آئیں گی۔ اب تو شادی کی کوئی تقریب نہیں ہے۔''اس نے میری بات پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

''شادی کی تقریب نہیں ہے مگر بہر حال تقریب تو ہے۔ آنے کا وعدہ نہیں کرتی البتہ کوشش ضرور کروں گی۔''وہ کہہ کر اندر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی اور میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

میلاد کی محفل میں وہ نہیں آئی تھی۔ وہ اور اس کی ایک بہن گھر پر رک گئی تھیں۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ آ جائے گی مگر...... میں اسی وقت ابو کو ایک کام سے جانے کا کہہ کر اس کی طرف گیا تھا۔ دروازے پر مجھے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ میں نے اس کے نہ آنے کا شکوہ کیا تھا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ اور کہتا اس کی بہن وہاں آ گئی پھر میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکا بس یہ کہہ کر نکل آیا کہ مجھے ان دونوں کے نہ آنے پر مایوسی ہوئی ہے۔ واپس گھر آ کر میں بہت بے چین تھا۔ تقریباً باقی سارا خاندان ہی وہاں موجود تھا مگر مجھے سب کچھ بالکل بیکار لگ رہا تھا۔ میں نے سب کچھ اس کے لیے کیا تھا مگر وہ......

اس دن پہلی بار احتشام سے ملتے ہوئے میں نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا اور پتا نہیں کیوں، اس سے بات کرتے ہوئے میں بہت روکھا ہو گیا تھا، شاید اس نے میری اس بات کو محسوس کر لیا تھا مگر مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ تعلیم کے علاوہ اس بندے میں اور ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اسے اہم بناتی یا وہ دوسروں سے برتر نظر آتا۔ مجھے پہلی بار وہ اپنا رقیب لگا تھا۔ اس دن میں بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ کیا یہ بندہ اس قابل ہے کہ فاطمہ جیسی لڑکی اس کی بیوی بنے، وہ اپنی ساری زندگی اس کے ساتھ گزارے۔ جوں جوں میں ان دونوں کے رشتے کے بارے میں سوچتا گیا، میرے غصے اور جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوا گیا اور اسی دن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں یہ شادی کسی صورت ہونے نہیں دوں گا۔ کم از کم میری زندگی میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس تقریب کے تیسرے دن میں یونیورسٹی پہنچ گیا تھا۔ وہ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہی تھی اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں جانتا تھا، وہ یونیورسٹی پوائنٹ کے ذریعے گھر جاتی تھی اور میں بہت دیر تک سٹاپ سے کچھ فاصلے پر اس کا انتظار کرتا رہا پھر میں نے اسے وہاں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے سٹاپ کے پاس رک گیا تھا اور پھر میں نے اسے اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھا۔ پہلی بار اپنی مسکراہٹ کے جواب میں، میں نے اس کے ماتھے پر کچھ شکنیں دیکھی، تاہم چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ میری طرف آ گئی تھی۔

''میں ادھر سے گزر رہا تھا، آپ کو دیکھا تو گاڑی روک لی۔ آئیں، آپ کو گھر ڈراپ کر دوں۔''میں اس کی سنجیدگی سے ذرا متاثر نہیں ہوا تھا۔

''آپ کا شکریہ لیکن بس آنے والی ہے، میں چلی جاؤں گی۔''

''پلیز آپ آ جائیں۔ میں آپ کے گھر ہی کی طرف جا رہا ہوں۔''میں نے اپنی بات پر اصرار کیا تھا۔ سٹاپ پر کھڑے سارے ہی لوگ

ہماری جانب متوجہ تھے۔

اس نے چند لمحے بہت عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں نے راستے میں اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہر بار ہوں ہاں کے علاوہ اور کچھ نہیں بولی، اس کے گھر کے دروازے کے پاس جب میں نے گاڑی روکی تو اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اب آپ اندر آ جائیں تاکہ اس محلے کے لوگوں کو یہ پتا چل جائے کہ میں جس کی گاڑی میں آئی ہوں، اس سے میرے گھر والے واقف ہیں۔''

میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے اندر چلا گیا تھا۔ ''یہ یونیورسٹی کی طرف سے گزر رہے تھے، سٹاپ پر مجھے دیکھا تو گاڑی روک دی۔ آج میں انہی کے ساتھ آئی ہوں۔ امی میرے سر میں درد ہو رہا ہے، میں سونے جا رہی ہوں، مجھے دو تین گھنٹے سے پہلے نہ اٹھائیں۔''

اس نے گھر کے اندر آتے ہی چچی کو دو مختلف باتیں ایک ہی جملے اور لہجے میں بتائی تھیں اور مجھ سے مزید کچھ کہے بغیر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اس کے بگڑے ہوئے تیوروں کا اندازہ ہو گیا تھا پھر بھی مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے اس بری طرح نظر انداز کرے گی۔ میں کھسیانا سا ہو کر دس پندرہ منٹ چچی کے پاس بیٹھا رہا اور پھر ان کے کھانے پر روکنے کے باوجود وہاں سے چلا گیا۔

میں نے دوبارہ کبھی یونیورسٹی جانے کی ہمت نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا، وہ میرے بارے میں کچھ غلط سوچے۔ وہ مجھے نظر انداز کرے یا وہ مجھے ناپسند کرے۔ میری مسکراہٹ کے جواب میں اس کے ماتھے پر شکنیں آئیں۔ اگلے کئی ہفتے میں اس سے ملنے کی ہمت نہیں کر پایا مگر وہ میرے ذہن سے معدوم نہیں ہوئی۔ وہ ہر وقت میرے پاس رہتی تھی اور رہی بھی۔

ڈیڑھ ماہ بعد...... پورے ڈیڑھ ماہ بعد میں نے اسے بڑے چچا کی بیٹی کی مہندی پر دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم باقی لوگوں کو اس تقریب میں کیا نظر آ رہا تھا مگر مجھے تو صرف وہ نظر آ رہی تھی اور میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اسی تقریب میں جب میرا اس کا سامنا ہوا تو اس نے مجھے بڑی گرم جوش مسکراہٹ سے نوازا تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے، اس کے دل میں میرے لیے کوئی میل نہیں آیا تھا۔

اسی تقریب میں وہ کھانا کھا رہی تھی، جب میں اس کے پاس گیا اور اسے ایک ضروری بات سننے کے لیے کہا۔ وہ کچھ حیرانی اور الجھن کے عالم میں میرے ساتھ آ گئی تھی۔ ایک ویران گوشے میں لے جا کر میں نے اسے کہا تھا۔

''پتا نہیں جو بات میں آپ سے کہنے والا ہوں، وہ آپ کو اچھی لگتی ہے یا نہیں مگر وہ سچ ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ بات آپ کو نامناسب بھی لگے مگر فاطمہ...... میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں ایک لمحہ کے لیے رکا اور اس کے چہرے کو دیکھا۔ فق رنگت کے ساتھ وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے، آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو اور آپ اسے مذاق سمجھ رہی ہوں مگر فاطمہ یقین کریں، یہ سچ ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی ہے اور وہ آپ ہیں اور آپ کے سوا......''

''آپ اپنا منہ بند کر لیں۔ آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اس نے یک دم بلند آواز سے میری بات کاٹ دی۔ وہ جیسے اپنے حواس میں

آ گئی تھی۔

''فاطمہ میرا دماغ خراب نہیں ہے، مجھے آپ سے......'' میں نے ایک بار پھر اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے آپ کی محبت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں احتشام کی منگیتر ہوں اور چند ماہ تک ہماری شادی ہو جائے گی۔ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔'' اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ میری بات ایک بار پھر کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا اور ہوگا تو میرے مرنے کے بعد ہی ہوگا۔'' میں اس کی بات پر جذباتی ہو گیا۔

''تو پھر مر جاؤ۔'' اس کے جواب نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔

''میں نے زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے اور وہ تم ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں کسی اور سے منسوب ہونے دوں گا۔'' میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''یہ بات اگر میں احتشام سے جا کر کہہ دوں تو وہ ابھی تمہیں شوٹ کر دے گا۔''

''اس سے پہلے میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ وہ کیا چیز ہے، آخر، ہے ہی کیا اس میں۔''

''وہ ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہے۔ تم تو اس کے پاؤں کے جوتوں کے برابر بھی نہیں۔'' میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے منہ سے اپنے لیے اتنے انسلٹنگ ریمارکس سنے تھے اور وہ بھی اس سے جس سے مجھے سب سے زیادہ محبت تھی۔

''تمہاری شادی اگر کسی سے ہوگی تو مجھ سے ہوگی فاطمہ۔ یہ بات لکھ لو، چاہے تمہاری خوشی سے ہو یا زبردستی۔''

''اور اس سے پہلے میں خودکشی کر لوں گی۔'' وہ غرائی تھی اور پھر تیزی سے وہاں سے جانے لگی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ''اور میں تمہیں مرنے تو کبھی نہیں دوں گا۔'' وہ جیسے میری حرکت پر شاکڈ ہو گئی تھی۔

''میں تمہارے منہ پر تھپڑ مارنا نہیں چاہتی اس لیے ہاتھ چھوڑ دو۔''

''میں لڑکیوں سے تھپڑ کھانا پسند نہیں کرتا۔'' میں نے اس کے غصے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑے رکھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کرے اور میں اس کو روکنے کے لیے بھی تیار تھا مگر اس نے جو حرکت کی، اس نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اس نے چند لمحے میرے چہرے پر نظریں جمائے رکھی تھیں اور پھر بڑے اطمینان سے اپنا وہ ہاتھ منہ کے پاس لے گئی جو میں نے پکڑا ہوا تھا۔ اس نے میری ہتھیلی کی پشت میں اپنے دانت گاڑ دیے تھے اور دانت اس نے اس زور سے اور اتنے اچانک گاڑے تھے کہ میں نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تم میری توقع سے زیادہ ذلیل ہو۔'' وہ کہتے ہوئے تیزی سے اندر چلی گئی تھی۔

میں نے ہتھیلی کی پشت پر دیکھا، وہاں اس کے دانتوں کے نشانات پر خون کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔ آپ کو حیرت ہوگی لیکن

یہ سچ ہے کہ مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ نہیں آیا بلکہ شاک لگا تھا۔ کیا وہ واقعی مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ اس نے مجھے زخمی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس سوچ نے مجھے گم صم کر دیا تھا۔ میں اسی خاموشی کے عالم میں وہاں سے واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔

اس شادی کے ہنگامے سے فرصت پانے کے بعد میرے گھر میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ میں نے اپنی امی پر فاطمہ کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا اور ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ میرا رشتہ لے کر اس کے گھر جائیں۔ میرے والدین کو اس بات پر شاک لگا تھا۔ امی ان دنوں میرے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں اور یہ کام میں نے خود ان کے سپرد کیا تھا اور اب اچانک میں نے ان کے سامنے ایک ایسی لڑکی پیش کر دی تھی جسے نہ صرف وہ لوگ ناپسند کرتے تھے بلکہ وہ منگنی شدہ بھی تھی۔ ان دونوں نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر میری ضد ختم نہیں ہوئی تھی۔

''اگر مجھے شادی کرنی ہے تو صرف فاطمہ سے، اس کے سوا کسی اور سے نہیں اگر آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' میں نے انہیں دوٹوک انداز میں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

میری امی میری بات پر رونے لگی تھیں۔ ''تمھیں وہ پسند تھی تو پہلے بتاتے، میں احتشام سے اس کی منگنی ہونے سے پہلے تمہارا رشتہ لے کر جاتی مگر اب تو......''

''منگنی ہوئی ہے۔ شادی تو نہیں ہوئی اور منگنیاں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ آپ ان سے کہیے گا کہ وہ اس رشتے کے لیے جو چاہیں مطالبہ کریں، میں پورا کروں گا۔'' میں نے جیسے اعلان کیا تھا۔

''تمہارا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔ کیا میرا بھائی اپنی بیٹی بیچ دے گا اس طرح۔ رشتہ کسی سے طے کرے، شادی کسی اور سے کرے۔ میں کس طرح اپنے بھائی سے جا کر یہ بات کہوں۔'' میرے ابو کو شاید زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا۔

''اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں احتشام کو گولی مار دوں گا مگر اس کی شادی فاطمہ سے نہیں ہونے دوں گا۔'' میری بات سے زیادہ شاید میرے لہجے نے میرے والدین کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں کچھ اور کہے بغیر گھر سے نکل گیا۔

اگلے چند دن تک گھر میں کوئی کھچڑی پکتی رہی اور پھر ایک شام میرے والدین فاطمہ کے گھر چلے گئے۔ میں خود گھر پر ہی تھا۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ بعض اوقات وقت بھی رک جاتا ہے جیسے اس شام رک گیا تھا۔ میں نے آج تک اتنی لمبی شام نہیں گزاری۔

وہ لوگ تقریباً چار گھنٹے کے بعد وہاں سے واپس آ گئے تھے اور ان کے چہرے دیکھتے ہی میں سب کچھ جان گیا تھا۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

''وہ لوگ کسی طرح بھی ہماری بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ چند ہفتوں تک ان دونوں کی شادی کی تاریخ طے کر رہے ہیں۔'' امی نے پھر بھی جیسے مجھے سب کچھ بتانا ضروری سمجھا۔

میں مشتعل ہو کر ان پر چڑھ دوڑا۔ ''آپ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ میری شادی اس سے ہو اگر آپ لوگوں نے کوشش کی ہوتی تو وہ آپ کی بات کیوں نہ مانتے۔ آخر ابو بڑے بھائی ہیں۔ ہر کام تو وہ ان کے مشورے سے کرتے ہیں پھر اب انھوں نے کیوں انکار کر دیا ہے۔''

''ہاں بڑا بھائی ہوں، میں مگر آخر میں کس طرح اس بے ہودہ بات پر اصرار کرتا۔ جو کہہ سکتا تھا، وہ میں نے کہا۔ تمھارے چچا کہہ رہے ہیں، فاطمہ کے علاوہ جس بیٹی سے چاہو، وہ تمہاری شادی کر سکتے ہیں مگر ایک بار اس کی نسبت طے ہو جانے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''مجھے کسی اور بیٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف فاطمہ سے ہی شادی کرنا ہے، صرف فاطمہ سے!'' میں ان کی بات پر چلایا تھا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ تمھیں بتایا ہے نا، چند ہفتوں تک وہ اس کی شادی کی تاریخ طے کر رہے ہیں۔''

''دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا، سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ نے میری مدد نہیں کی، ٹھیک ہے اب مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' مجھے واقعی اپنے والدین سے بہت مایوسی ہوئی تھی۔

امی اٹھ کر میرے پیچھے میرے کمرے میں آ گئی تھیں اور پتا نہیں کتنی دیر مجھے سمجھاتی رہی تھیں کہ میں کوئی الٹا سیدھا کام نہ کروں۔ دنیا میں فاطمہ سے زیادہ اچھی لڑکیاں ہیں اور وہ فاطمہ سے بھی بہتر لڑکی میرے لیے لائیں گی۔ میں ان کی ہر بات سنی ان سنی کرتا رہا اور اپنے اعصاب پر قابو پاتا رہا۔ جب وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو کر چلی گئیں کہ شاید ان کی باتوں نے مجھ پر کوئی اثر کیا ہے تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆......✪......☆

میں فاطمہ سے آخری بار بات کرنے کے لیے چار پانچ دن کے بعد اس کے ڈیپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی اور پھر چند لمحوں کے اندر اندر اس کے چہرے کا رنگ بھی سرخ ہو گیا مگر مجھے اس کی حیرت کی پروا تھی نہ غصے کی۔ میں نے اس کے قریب جا کر بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں، مجھے یہاں دیکھ کر تمھیں بہت غصہ آ رہا ہوگا مگر مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اس لیے یہاں آنا پڑا۔'' اس نے جواب میں کچھ تلملا کر کہا۔

''یہ وہی ضروری بات ہوگی جس کا جواب تمھارے ہاتھ پر ہے۔'' مجھے اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آ ئی۔ اس کا اشارہ دانتوں کے نشان کی طرف تھا۔ میری ہنسی نے اسے کچھ اور برہم کیا مگر شاید میرے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس دن ایک بار پھر میری بات سننے پر تیار ہو گئی۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ اگر وہ مجھ سے اس طرح جان چھڑا سکتی ہے تو کیوں نہ چھڑوا لے اور واقعی میں اس دن کے بعد اس سے دوبارہ نہ ملنے کا طے کر کے گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے اور اس کے درمیان ہونے والی وہ آخری گفتگو تھی مگر تقدیر ہمارے لیے کچھ اور طے کر کے بیٹھی تھی۔ خیر میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں اسے یونیورسٹی کے لان میں لے گیا اور وہاں میں نے ایک بار پھر اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے لیے کیا کیا کر سکتا ہوں اور میں نے اسے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ احتشام کے ساتھ شادی اس کے لیے کتنی بیکار ہے۔ یقین جانیں، جتنی نرمی، محبت اور خلوص کے ساتھ میں اسے سمجھا سکتا تھا، میں نے اسے سمجھایا مگر پتا نہیں اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت کیوں بھری ہوئی تھی کہ وہ میری کوئی بات ٹھیک سے سننے پر تیار تھی، نہ سمجھنے پر۔ اس کے دل و دماغ پر تو وہ خبیث اور ذلیل...... احتشام ...... خیر چھوڑیں، اب اتنے عرصے کے بعد اسے گالیاں دینے کا کیا فائدہ مگر آپ تو جانتے ہی ہیں، رقیب سے نفرت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ بہر حال اس دن میری باتوں کے جواب میں اس نے میرے لیے کچھ ایسے لفظ استعمال کیے جنھوں نے نہ صرف میری ناراضگی اور برہمی میں اضافہ کیا بلکہ میرے ارادے کو کچھ اور پختہ کر دیا۔ ارادہ کیا تھا، وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ جب مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میری کوئی دلیل، کوئی بات اس پر اثر انداز نہیں ہو پائے گی تو پھر میں اس سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ اب دوبارہ اسے مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی، نہ ہی ہم دوبارہ اس موضوع پر بات کریں گے۔

آپ یقیناً میری اس بات پر حیران ہو رہے ہوں گے کہ کہاں تو اس کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا تھا اور کہاں صرف بات کرنے کے بعد میں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔ نہیں میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا مگر اس سے یہ کہنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بعد میں جو قدم اٹھانے والا تھا، اس کے بارے میں فوری طور پر سب کی توجہ مجھ پر مرکوز ہو جائے۔ اس لیے میں نے نہ صرف فاطمہ کو یہ یقین دلایا کہ اب میں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے بلکہ اپنی امی اور ابو کو فاطمہ کے گھر دوبارہ بھیجا تاکہ وہ معذرت کر کے فاطمہ کے گھر والوں پر یہ جتا دیں کہ وہ اپنی حرکت پر شرمندہ ہیں۔

سب کچھ میری حسب توقع ہی ہوا۔ فاطمہ کے گھر والے نہ صرف میرے والدین کی معذرت پر بے حد مطمئن ہو گئے بلکہ انھوں نے

نہایت خوش دلی سے انھیں معاف بھی کر دیا۔ چچا نے یقیناً یہ سوچا ہو گا کہ بڑے بھائی کے ساتھ ان کے تعلقات ختم ہونے سے بچ گئے ہیں اور جس خلش کا وہ شکار ہوئے ہوں گے، یقیناً وہ خلش بھی دور ہو گئی تھی۔

میرے ماں باپ کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ میں اتنا اعلیٰ ظرف کیسے ہو گیا کہ انھیں چچا اور چچی سے معذرت کے لیے کہہ رہا ہوں مگر پھر انھوں نے سوچا ہو گا کہ شاید ان کی کوئی نیکی ان کے کام آ رہی ہے اور میں اپنی ضد چھوڑ رہا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، والدین ایسے معاملات میں ہمیشہ اسی طرح سوچتے ہیں مگر میں نے اپنی ضد چھوڑی تھی اور نہ ہی میں اتنا اعلیٰ ظرف ہو گیا تھا کہ اپنے ایک ایسے کام کے لیے معافیاں تلافیاں شروع کر دیتا جسے میں سرے سے غلط سمجھتا ہی نہیں تھا۔

زندگی میں بعض فیصلے ہم سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، بعض بغیر سوچے سمجھے۔ جو فیصلے سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، وہ دماغ سے کرتے ہیں، جو بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں، وہ دل سے کرتے ہیں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ بعض دل سے کیے جانے والے فیصلے ہمیں اس قابل کر دیتے ہیں کہ ہم دوسروں کا دل اور دماغ دونوں جیت لیں تو کیا آپ میری اس بات پر یقین کریں گے۔ شاید نہیں، بہر حال اس رات میں نے بھی بغیر سوچے سمجھے صرف دل کے کہنے میں آ کر ایک فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے نے۔ خیر...... بہتر ہے، میں آپ کو بتا دوں کہ میں نے فاطمہ کو اغواء کروانے کا فیصلہ کیا تھا۔

آپ میں سے جو میری طرح جذباتی ہوں گے، وہ اس وقت مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے، خاص طور پر لڑکیاں مگر اتنے غصے اور جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ پہلے میرا نقطہ نظر تو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں جانتا ہوں، اغوا کوئی اچھا قدم نہیں تھا، خاص طور پر کسی لڑکی کا اغوا اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ لڑکی خاندان کی ہو تو یہ اور بھی معیوب بات ہے مگر اس وقت میں بس غصے میں تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی شدت سے کسی چیز کی خواہش کی تھی مگر وہ چیز مجھے ملنے کے بجائے کسی اور کا مقدر بن جانا چاہتی تھی اور یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ اگر فاطمہ میری نہیں ہو سکتی تھی تو پھر اسے احتشام کا بھی نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر اسے احتشام کا مقدر بننا ہی تھا تو بھی میں چاہتا تھا کہ احتشام کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے خاندان کی سب سے اچھی لڑکی کا ساتھ نصیب ہو رہا ہے۔ اس لڑکی کا جس نے اس کے لیے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میں چاہتا تھا، فاطمہ سے شادی ہونے کی صورت میں بھی وہ کبھی کوئی فخر محسوس نہ کر سکے۔ جب کوئی میری طرح ٹھکرایا جاتا ہے تو پھر وہ اسی طرح کے حسد کا شکار ہوتا ہے، سو اس رات میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں فاطمہ کو ایک آخری موقع دوں گا اس سے بات کروں گا اور اگر اب بھی اس نے میری آفر قبول نہ کی تو پھر میں فاطمہ کو اغوا کروا لوں گا۔ چند دن تک بحفاظت اسے کہیں رکھوں گا اور پھر رہا کر دوں گا اور یہ چند دن جو وہ باہر گزار کر آئے گی، یہ اس کے لیے خاندان میں اچھی خاصی رسوائی اور بدنامی کا باعث بنیں گے اور پھر احتشام اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اگر مجبور ہو کر اس نے کر بھی لی تو یہ ایک مجبوری کا سودا ہی ہو گا اور پھر رسوائی صرف فاطمہ ہی کے لیے نہیں بلکہ احتشام کے لیے بھی ہو گی۔ آپ خود سوچیں ایک اغوا شدہ لڑکی سے شادی ہمارے معاشرے میں کسی بھی مرد کے لیے کتنی بڑی ذلت ہے اور میں اس ذلت سے احتشام کو دوچار کرنا چاہتا تھا۔

چند دن گزرنے کے بعد میں نے فاطمہ سے بات کی اور میں نے آپ کو بتایا نا کہ اس نے انتہائی غیر مہذب الفاظ میں میری آفر ٹھکرا دی۔ مجھے اس سے یہی امید تھی اس لیے میں بالکل مایوس نہیں ہوا۔ اس دن میں یونیورسٹی میں فاطمہ سے ملنے کے بعد واپس گھر آیا، نہ ہی فیکٹری گیا بلکہ اپنے

کچھ ''دوستوں'' کے پاس چلا گیا۔

میں ایک بہت سی سیدھی سادی زندگی گزارنے والا انسان تھا۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے زندگی میں کبھی اس طرح کوئی کام کرنا یا کروانا پڑے گا مگر سوچنے سے کیا ہوتا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بلنڈر بغیر سوچے سمجھے ہوتے ہیں۔

میرا حلقہ احباب بھی بہت وسیع تھا، اس میں ہر کیٹگری کے لوگ تھے۔ بہت اچھے...... برے اور بہت برے لیکن میرے لیے سب دوست تھے اور جب کوئی آپ کا دوست ہو تو ہم اس کی بہت سی خامیاں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہت سے عیبوں سے نظر چراتے رہتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتا تھا۔ دوست بناتے ہوئے میرے نزدیک واحد معیار یہ ہوتا تھا کہ وہ کتنا اثر و رسوخ اور دولت والا ہے۔ باقی چیزیں میرا مطلب ہے، کردار وغیرہ میرے نزدیک بہت ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ میرے دوستوں میں کچھ لوگ جرائم پیشہ بھی تھے۔ نہیں...... نہیں انھوں نے کوئی بہت بڑے بڑے جرم نہیں کیے تھے۔ بس شوقیہ چھوٹے موٹے جرائم کرتے رہتے تھے۔ مثلاً لڑکیوں سے پرس چھین لینا، کسی سے گاڑی چھین لینا یا پھر ڈیپارٹمنٹ اسٹورز سے مہنگی چیزیں پار کر لینا۔ میں ان سب کے کارناموں سے واقف تھا اور ہم اکثر ان حرکتوں کا ذکر کر کے ہنستے تھے۔ میں ان حرکتوں کو پسند نہیں کرتا تھا مگر میں نے کبھی اپنے دوستوں کو ان باتوں سے منع بھی نہیں کیا تھا کیونکہ میرے خیال میں یہ ان کا ذاتی فعل تھا اور مجھے مداخلت کا حق نہیں تھا۔

شجاع بھی میرے کچھ ایسے ہی دوستوں میں شامل تھا جو ایسی سرگرمیوں میں انوالو تھا۔ میری اس کے ساتھ بہت گہری اور بہت پرانی دوستی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک جاگیردار کا بیٹا تھا مگر تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر بھیجے جانے کے بعد مستقل یہیں کا ہو گیا تھا۔ تعلیم تو اس نے خیر کیا حاصل کرنی تھی مگر ''علم'' کافی حاصل کیا، بدلتی دنیا کے نئے طور طریقوں کا۔ تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں نے شجاع کا ''ہنر اور علم'' آزمانے کا فیصلہ کیا اور اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے میری بات بڑے تحمل اور سکون سے سنی۔

''تم اپنی کزن کو اغوا کروانا چاہتے ہو اور چاہتے ہو کہ دو تین دن کے بعد اسے بحفاظت واپس چھوڑ دیا جائے مگر اس سے تمھیں کیا ملے گا؟ کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' وہ میری بات سننے کے بعد کچھ الجھ گیا۔

''نہیں، میں اب اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ بس تم مجھ سے زیادہ سوال جواب مت کرو۔ صرف یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کر سکتے ہو یا نہیں؟''

''ایک لڑکی کا اغوا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر اس کا کچھ فائدہ بھی تو ہو۔''

''فائدہ اور نقصان تمہارا نہیں، میرا مسئلہ ہے۔'' میں کچھ چڑ گیا۔

''ٹھیک ہے یار، جو تم چاہو گے، وہی ہو گا، اب ناراض تو مت ہو'' اس نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔

''اور شجاع، یہ بات یاد رکھنا کہ اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے اگر اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی......'' شجاع نے میری بات کاٹ دی۔

''تمھیں دوبارہ یہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمھارے خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو ظاہر ہے، میرے لیے بھی قابل احترام ہے۔''

’’میں اس کی بات پر مطمئن ہوگیا۔ آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک طرف تو میں اس کے اغوا کا منصوبہ بنا رہا تھا اور دوسری طرف اس کی سلامتی کے لیے فکر مند تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں فاطمہ کے لیے اپنے دل میں بہت سی رنجشیں رکھتا تھا، یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں چاہتا تھا، وہ خاندان میں رسوا......اور بدنام ہو جائے مگر میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میرے خاندان کی کوئی لڑکی کسی اور طرح کی ذلت کا شکار ہو اور وہ بھی میرے ہی ایک دوست کے ہاتھوں......اور پھر......شاید میں یہ اس لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ لڑکی فاطمہ تھی جس سے میں نے محبت......خیر اس ذکر کو چھوڑیں۔

میں نے شجاع سے کہا کہ وہ اگلے کچھ دنوں میں فاطمہ کی روٹین معلوم کرے، وہ کتنے بجے یونیورسٹی جاتی ہے، کس روٹ سے جاتی ہے اور اسی طرح اس کی واپسی کے بارے میں بھی۔ فاطمہ کے بارے میں کچھ ضروری تفصیلات میں نے اسے بتا دی تھیں اور کزن کی شادی پر کھینچی جانے والی اس کی ایک تصویر بھی اسے دے دی تھی۔

شجاع نے اگلے کچھ دنوں میں پورا پلان ورک آؤٹ کر کے مجھے دے دیا مگر میں فوری طور پر ابھی اس کا اغوا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، کچھ دن اور گزر جائیں۔ میرے پرپوزل والا ایشو اچھی طرح دب جائے پھر میں اپنے پلان پر عمل کروں۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزرا اور پھر اچانک مجھے پتا چلا کہ احتشام اور فاطمہ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔ اب مجھے جو کچھ کرنا تھا، وہ اس سے پہلے پہلے کرنا تھا کیونکہ ایک بار فاطمہ گھر بیٹھ جاتی تو ہمارا سارا پلان خراب ہو جاتا۔

جس دن اس منصوبے پر عمل ہونا تھا، اس دن میں نے ایک ریسٹورنٹ میں اپنے چند دوستوں کو چھوٹی سی پارٹی دی تھی اور یہ پارٹی ٹھیک اس وقت تھی، جب فاطمہ کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ میں بہت محتاط تھا۔ کسی قسم کے شک وشبے سے بچنے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا کیونکہ اگر پولیس تحقیق شروع کرتی تو پھر ہوسکتا ہے، مجھ پر شبے کا اظہار کیا جاتا اور اس وقت میری کوئی ایسی مصروفیت ضروری تھی جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ مجھے دیکھتے اور بعد میں میرے حق میں گواہی دے سکتے۔

پارٹی میں شامل کسی بھی دوست کو فاطمہ کے اغوا کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ دراصل وہ فاطمہ کے اغوا کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی اور جب ہوئی تو میں نے اسے ممکنہ حد تک اپنے دوستوں سے چھپا کر رکھنے کی کوشش کی۔ پوری پارٹی کے دوران میں نہ چاہتے ہوئے بھی بے حد نروس تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جہاں مجھے ایک طرف یہ فکر تھی کہ پتا نہیں منصوبے پر ٹھیک طرح سے عمل ہوتا ہے یا نہیں، وہاں یہ بھی پریشانی تھی کہ فاطمہ بخیریت ہو حالانکہ میں بار بار شجاع سے کہہ چکا تھا پھر بھی مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کر بیٹھے۔

پارٹی چار بجے ختم ہوئی اور پارٹی ختم ہونے کے بعد میں گھر چلا آیا مگر اس سے پہلے میں ایک پی سی او سے شجاع کو فون کر چکا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ منصوبہ پوری طرح سے کامیاب ہوا ہے اور وہ فاطمہ کو اغوا کر چکا ہے۔ فاطمہ کو اغوا کرنے کے بعد وہ اپنے ایک بنگلے میں لے آیا تھا اور چوری کی وہ گاڑی جس پر فاطمہ کا اغوا ہوا تھا وہ بھی شہر کے ایک بارونق علاقے میں چھوڑی جا چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر شجاع کو ہدایت کی کہ

فاطمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ وہ ابھی بے ہوش تھی اور میں اس لیے بھی زیادہ فکر مند تھا۔

''یار، تمھیں ایک بار میری بات پر اعتبار کر لینا چاہیے۔ میں قول کا اتنا کچا نہیں ہوں۔'' شجاع نے ایک بار پھر مجھے دلاسا دیا۔ میں اسے کچھ اور ہدایات دے کر گھر چلا آیا۔

''تمھارے ابو کو تمھارے سب سے چھوٹے چچا نے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا، وہ کافی پریشانی میں گئے ہیں۔'' امی نے گھر پہنچتے ہی مجھے اطلاع دی۔ میں بے اختیار کچھ نروس ہو گیا۔

''کیوں سب خیریت تو ہے نا وہاں؟ کوئی بیمار تو نہیں ہے؟'' میں نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔''

''تو آپ فون کر کے پوچھ لیتیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''میں نے فون کیا تھا مگر تمھارے ابو نے کچھ بتانے کے بجائے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ جب تم گھر آؤ تو تمھیں بھی چچا کے گھر بھیج دوں۔'' میرا دل امی کی بات پر ایک دم دھڑک اٹھا مگر بظاہر نارمل نظر آتے ہوئے میں نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں، پتا نہیں کیا بات ہے؟ کوئی جھگڑا نہ ہو گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''تم وہاں جا کر فون کر کے مجھے بتانا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ اتنی پُراسراریت کیوں برتی جا رہی ہے؟'' امی نے پُرتجسس انداز میں کہا، میں سر ہلاتا ہوا باہر آ گیا۔

گاڑی کو حتی المقدور آہستہ اسپیڈ سے چلاتے ہوئے میں نے آدھے گھنٹے کا راستہ ایک گھنٹے میں طے کیا اور حویلی پہنچ گیا۔ گیٹ پر پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن یک دم اور تیز ہو گئی۔ چند لمحے میں خود کو نارمل کرتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے چہرے پر کوئی ایسے تاثرات ہوں جن سے مجھ پر شبہ ہو سکے کیونکہ اندر نہ صرف مجھے پورے خاندان کا سامنا کرنا تھا بلکہ پولیس والوں کے سامنے بھی جانا تھا اور ان کی نظروں کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میرا جس سے سامنا ہوا تھا، وہ احتشام تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں نے بہت نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے علیک سلیک کی۔

''ابو نے کہا تھا کہ میں فوراً یہاں پہنچ جاؤں۔ سب خیریت تو ہے نا۔ باہر موبائل بھی کھڑی ہے۔ کسی کا جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟'' میں نے سلام کرتے ہی اس سے پوچھنا شروع کر دیا۔

''فاطمہ کو یونیورسٹی سے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا؟'' میں یک دم چلایا۔ ہر ڈرامے اور فلم میں شدید حیرت کا اظہار اسی طرح کیا جاتا ہے۔ ''کیا کہہ رہے ہو احتشام۔'' میں نے اپنے چہرے پر شاک کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''میں سچ بتا رہا ہوں۔''

''لیکن یہ ہوا کیسے؟''

''یونیورسٹی سے پہلے فون آیا پھر انھوں نے ہی ایف آئی آر لکھوا دی، ہمیں تو انہی لوگوں سے پتا چلا ہے سب کچھ۔''

''مگر فاطمہ کو کون اغوا کر سکتا ہے؟ کیا چچا کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟''

''نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے اسی لیے تو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کسی نے فاطمہ کو کیوں اغوا کیا ہے، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ......''

''ہو سکتا ہے، اسے کسی اور لڑکی کی غلط فہمی میں اغوا کیا گیا ہو۔'' میں نے فوراً اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''اگر ایسا ہوتا تو بھی اب تک وہ لوگ اسے چھوڑ چکے ہوتے مگر وہ اب تک گھر نہیں آئی۔'' وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا اور اس کی پریشانی سے مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ اگر وہ فاطمہ کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو فاطمہ کو اس پریشانی سے گزرنا پڑتا، نہ ہی مجھے یہ قدم اٹھانا پڑتا۔ یہ سب احتشام کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے سارا الزام اس کے سر رکھ دیا۔

پھر اسی کے ساتھ میں اندر گیا۔ بڑے چچا کے ڈرائنگ روم میں خاندان کے سارے مردوں کے ساتھ چند پولیس والے بھی موجود تھے۔ میں حتیٰ المقدور پرسکون چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا مگر چہرے پر کچھ رنجیدگی کے تاثرات ضرور تھے۔ خاصی گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا گیا تھا پھر ابو میری طرف لپکے تھے۔

''یہ سب کیا ہوا ہے ابو، احتشام مجھے بتا رہا تھا کہ......'' ابو نے میری بات کاٹ دی۔

''ہاں فاطمہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم کہاں تھے، میں نے اتنی دیر کا پیغام چھوڑا ہوا ہے، تمھارے لیے۔''

''ابو، میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں لنچ کر رہا تھا۔ ابھی گھر پہنچا تو امی نے ادھر بھیج دیا۔'' میں نے انھیں بتایا۔

وہ مجھے ساتھ لیے چھوٹے چچا کے پاس چلے گئے جو صوفے پر بیٹھے نڈھال نظر آ رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے انھیں تسلی دینی شروع کی۔

''چھوٹے چچا، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ فاطمہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے، اسے کسی دوسری لڑکی کے دھوکے میں اغوا کر لیا گیا ہو ورنہ فاطمہ تو بہت اچھی لڑکی ہے۔'' میری باتوں سے ان کی رنجیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا مگر انھوں نے سر ہلا دیا۔ میں پولیس والوں کی نظروں کو مسلسل خود پر محسوس کر رہا تھا مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ پولیس والے ایسے موقع پر ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

''یہ کون ہیں؟'' ایک پولیس والے نے میرے بارے میں استفسار کیا۔

''یہ میرے سب سے بڑے بھائی کا اکلوتا بیٹا ہے۔'' چھوٹے چچا نے پھیکے لہجے میں کہا۔

''اچھا، کیا کرتے ہیں؟'' اس بار عقابی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا گیا۔

میں نے مختصراً اپنا تعارف کروایا۔

''اس وقت آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''دوستوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں لنچ تھا، وہاں سے گھر آیا تو ابو کا پیغام ملا کہ یہاں آجاؤں۔'' میری بات پر چھوٹے چچا نے مداخلت کی۔

''آپ اظفر سے اس طرح چھان بین کیوں کر رہے ہیں، یہ تو میرے بیٹے جیسا ہے۔''

''نہیں چھوٹے چچا، کوئی بات نہیں، ان کا کام ہی تفتیش کرنا ہے، انھیں اپنا کام کرنے دیں۔'' میں نے بڑی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس انسپکٹر کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے کہا۔ اس نے مجھ سے چند اور سوال کیے اور اس کے بعد باقی پولیس والوں کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔

جوں جوں اندھیرا چھا رہا تھا حویلی میں ایک سوگ کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر فاطمہ کو میں نے اغوا نہ کیا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی ان لوگوں کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اتنی ہی تکلیف کا شکار ہوتا مگر اب اس کو اغوا کرنے کے بعد میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس ہے اس لیے میں مصنوعی پریشانی کے تاثرات لیے چچا اور ان کے گھر والوں کو تسلیاں دیتا رہا۔ میری امی بھی وہاں آچکی تھیں بلکہ پورا خاندان ہی وہاں جمع تھا۔ لوگ طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، ایسے موقع پر لوگوں کو اپنے دل کا غبار نکالنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے۔ لوگوں کو مسئلے کے حل میں اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی مشورہ دینے میں۔ وہاں موجود سب لوگ بھی یہی کرنے میں مصروف تھے اور میں بڑے اطمینان سے وہاں موجود لوگوں کے تاثرات سے ان کے دلوں کا حال جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

رات گئے میں اپنے والدین کے ساتھ واپس گھر آگیا۔ گھر آنے کے بعد میں نے نہ تو شجاع کو فون کرنے کی کوشش کی، نہ ہی اس کے پاس جانے کی کوشش کی۔ یہ دونوں چیزیں میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں کیونکہ ہو سکتا تھا، پولیس نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہوتی اور میرا فون ٹیپ ہو رہا ہوتا یا میرا پیچھا کیا جاتا اس لیے میں اطمینان کے ساتھ گھر پر ہی رہا مگر رات کو میں کچھ بے چین ضرور تھا۔

اگلے دن صبح ہی صبح میں نے ایک پی سی او سے شجاع کو فون کیا اور اس سے فاطمہ کے بارے میں پوچھا۔

''یار، تمہاری کزن عجیب لڑکی ہے۔ نہ اس نے کوئی رونا دھونا مچایا ہے، نہ ہی کوئی ہنگامہ کھڑا کیا ہے، بس خاموش ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں نے کس کے کہنے پر اسے اغوا کیا ہے۔ میرے نہ بتانے پر اس نے پوچھنے پر اصرار نہیں کیا۔'' وہ مجھے فاطمہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ ایسی ہی لڑکی ہے مگر شجاع یہ نہیں جانتا تھا۔ اسے فاطمہ کے بارے میں کچھ اور ہدایات دے کر میں واپس گھر آگیا۔

گھر پر ابو بے حد پریشان تھے۔ بھائیوں سے ان کے تعلقات پہلے جیسے نہ سہی مگر بہر حال نواز چچا ان کے بھائی تھے اور فاطمہ ان کی بھتیجی ان کی پریشانی فطری تھی۔ میری امی بے حد مطمئن تھیں بلکہ شاید شکر کر رہی تھیں کہ فاطمہ سے میری نسبت طے نہیں ہوئی تھی ورنہ شاید آج ہم لوگ بھی اسی پریشانی سے گزر رہے ہوتے۔ اب یہ انھیں کون بتاتا کہ اگر فاطمہ کی نسبت مجھ سے طے ہو جاتی تو پھر فاطمہ کے اغوا کی نوبت ہی نہیں آتی۔

وہ سارا دن بھی میں نے حویلی میں ہی گزارا۔ احتشام کے گھر جانے سے پہلے میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ وہ میرے اس کارنامے سے واقف نہیں تھا۔ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے فون کو استعمال کرتے ہوئے شجاع سے بات کی اور اس سے ہونے والی گفتگو نے مجھے کچھ اضطراب میں گرفتار کر دیا۔

''یار، تمہاری کزن نے تو آج مجھے پریشان ہی کردیا۔'' شجاع نے فون ملتے ہی کہا۔ میں کچھ بے چین ہوگیا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ہونا کیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جانتی ہوں کہ مجھے کس نے اغوا کیا ہے؟'' شجاع کی بات پر ایک لمحے کے لیے میرا سانس رک گیا۔

''کیا؟'' میں نے بے اختیار کہا۔

''گھبراؤ مت، میں بھی ایسے ہی پریشان ہوگیا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے میرے کزن نے اغوا کیا ہے۔'' شجاع کی اگلی بات پر میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا، وہ اس قدر ذہین تھی کہ مجھے بوجھ لیتی۔ مجھے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا نظر آنے لگا تھا۔

''میں نے اس سے پوچھا، کون سے کزن نے؟ تو اس نے کہا احتشام نے؟'' شاید مجھے 440 وولٹ کا کرنٹ بھی لگتا تو مجھے اتنا شاک محسوس نہیں ہوسکتا تھا، جتنا مجھے شجاع کی اس بات سے محسوس ہوا تھا۔

''یہ احتشام کون ہے اظفر؟'' اب شجاع مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ جبکہ میرا ذہن غوطے کھا رہا تھا کہ اس نے احتشام کا نام اس سلسلے میں کیوں لیا۔

''تمہیں یقین ہے، اس نے احتشام کا ہی نام لیا تھا؟'' میں نے کچھ بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں یار، مجھے کوئی دھوکا کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ کچھ برا مان گیا۔ ''اور اس نے یہ بھی فرمائش کی ہے کہ جب اسے رہا کیا جائے تو بے ہوش نہ کیا جائے بلکہ آنکھوں پر پٹی باندھ کرلے جایا جائے اب تم بتاؤ کہ اس کی بات مانی جائے یا نہیں۔'' شجاع مجھ سے پوچھ رہا تھا، جبکہ میں ابھی تک الجھا ہوا تھا اور اسی الجھن میں، میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ فاطمہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے رہا کرے۔

مگر اصل جھٹکا تو ابھی میرا منتظر تھا۔ فاطمہ کو اگلے دن دوپہر کے بعد رہا کرنا تھا اور میں اس وقت اپنے گھر چلا گیا تاکہ شجاع مجھے اس کی رہائی کی اطلاع دے سکے۔ دوپہر کے بعد شجاع نے فون پر مجھے انفارم کردیا تھا کہ میں نے فاطمہ کو کس علاقے میں چھوڑا ہے۔ میں مطمئن ہوکر گھر سے نکلنے ہی والا تھا، جب ملازم نے مجھے کسی لڑکی کے فون کی اطلاع دی۔ میں کچھ حیران ہوکر فون کی طرف آیا کیونکہ میرے کسی لڑکی سے اتنے اچھے اور قریبی تعلقات نہیں تھے کہ وہ میرے گھر فون کرتی مگر فون پر فاطمہ کی آواز سن کر مجھے یوں لگا تھا، جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس سے زیادہ حیران کن بات کیا ہوسکتی تھی کہ رہا ہونے کے بعد گھر جانے کے بجائے یا گھر فون کرنے کے بجائے وہ مجھے فون کررہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''فاطمہ، تم کہاں سے بات کررہی ہو؟''

''میں ایک پی سی او سے بات کررہی ہوں۔'' مجھے اس نے روتے ہوئے بتایا تھا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ سچ ہے کہ اس وقت اسے اس طرح روتے ہوئے بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے تکلیف ہورہی تھی حالانکہ یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا تھا پھر بھی میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''فاطمہ دیکھو پلیز، خاموش ہوجاؤ۔ روؤ مت، مجھے اس پی سی او کا پتا بتاؤ، میں وہاں آجاتا ہوں۔'' میری بات کے جواب میں اس نے جو

کہا تھا، اس نے حقیقی معنوں میں میرے وجود کو برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں روتے ہوئے کہا۔

''اظفر ان لوگوں نے میرے ساتھ...... میرے ساتھ بہت بدتمیزی کی ہے۔'' چند لمحوں کے لیے میں کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میری ہدایات کے باوجود شجاع...... اگر فاطمہ کو کچھ...... میں نے تقریباً چلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا ہے فاطمہ؟''

''میں نہیں بتا سکتی، بس میں نہیں بتا سکتی۔ میں اب مرجانا چاہتی ہوں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا، میں شجاع کے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے پھینک دوں۔ میں نے اس سے کہا تھا پھر بھی اس نے، آپ تو جان ہی گئے ہوں گے، میں کیا سمجھ رہا تھا۔ میں اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ جب بات کرتے کرتے اس نے کہا کہ وہ میرے گھر آ رہی ہے اور اسے مجھ سے ایک پسٹل چاہیے جس سے وہ احتشام کو شوٹ کر سکے تو میں اس سے کوئی بات ہی نہیں کر سکا اور جب میں بات کرنے کے قابل ہوا تو وہ فون بند کر چکی تھی۔

اس کے فون بند کرنے کے فوراً بعد میں نے تمام احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شجاع کو فوراً فون کیا اور اس کی آواز سنتے ہی میں اس پر برس پڑا۔ میری زبان پر جتنی گالیاں آ سکتی تھیں، میں نے اسے دے ڈالیں۔ وہ حیرانی سے مجھے گالیاں بکتے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا مگر میں نے اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت میں جس ذہنی کیفیت میں تھا، اس میں میں اس کی کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔

''یقین کرو اظفر، میں نے تمہاری کزن کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ میں نے تو اسے بہن کی طرح رکھا ہے۔'' اس نے قسم کھاتے ہوئے بالآخر کہا۔ جواب میں، میں نے اسے کچھ اور گالیاں دیں۔

''فاطمہ جھوٹ نہیں بولتی اور اس نے خود مجھے کہا ہے کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ...... شجاع، میں تم لوگوں کو قبر میں اتار دوں گا، تم یاد رکھنا۔''

''تمہاری کزن جھوٹ بول رہی ہے۔ الزام لگا رہی ہے ہم پر۔ ہم لوگوں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔'' وہ قسمیں کھاتا رہا مگر میں نے دھمکیاں اور گالیاں دینے کے بعد فون بند کر دیا۔

اب میں فاطمہ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس سے ساری تفصیلات جاننا چاہتا تھا اور اس کے بعد ہی میں طے کرنا چاہتا تھا کہ مجھے شجاع کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ میں اپنی گاڑی گیٹ سے باہر نکال لایا تھا اور بے چینی سے سڑک پر چکر لگا رہا تھا، جب وہ ایک رکشے پر آئی اور مجھے دیکھتے ہی رونے لگی۔

اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور میری اذیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر لے آیا پھر میں نے اس سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ شجاع نے اس کے ساتھ کیا کیا اور یہ جان کر میری جان میں جان آئی کہ بدتمیزی کا سلسلہ صرف باتوں تک ہی محدود رہا تھا، انھوں نے اسے کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔

''مجھے پسٹل چاہیے۔ میں احتشام کو شوٹ کرنا چاہتی ہوں۔ یہ اغوا اسی نے کروایا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''مگر وہ تمہیں اغوا کیوں کروائے گا؟''

''میں نے تم سے ہونے والی ساری باتیں اسے بتا دی تھیں اور اس کے بعد اس کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا، جیسے وہ مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا، کسی نہ کسی طرح مجھ سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی تمہارے ساتھ انوالو ہو چکی ہوں۔ تم دیکھو اس نے اسی لیے شادی سے پہلے اس طرح مجھے اغوا کیا ہے تاکہ مجھ سے شادی سے انکار کر دے مگر وہ مجھ سے شادی سے انکار کیا کرے گا، میں خود اس سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ جو اس طرح کے گھٹیا حربے استعمال کرے۔ اظفر، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی، میں اسے مار ڈالوں گی۔'' وہ اس وقت جنونی ہو رہی تھی۔

آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اسے احتشام سے اس طرح بدگمان دیکھ کر میری خوشی کن انتہاؤں کو چھو رہی ہو گی مگر بظاہر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ شاید اسے غلط فہمی ہو گئی ہو اور احتشام نے اسے اغوا نہ کروایا ہو مگر وہ میری بات پر اور مشتعل ہو گئی۔ وہ گھر جانا بھی نہیں چاہتی تھی مگر میں نے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے احتشام کو شوٹ کرنے کا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور پھر میں زبردستی اسے اس کے گھر لے آیا۔

ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ اس وقت میں کن فضاؤں میں پرواز کر رہا ہوں گا۔ ایک لڑکی جس کی نظروں میں آپ کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو، ایک دم آپ اس کی نظروں میں وہ وقعت حاصل کر لیں کہ کوئی دوسرا آپ کے سامنے ٹھہر ہی نہ سکے تو بندہ کیا محسوس کرتا ہے۔ میرا ہر وار کامیاب رہا تھا۔ یہ اغوا میرے لیے بہت ہی پروڈکٹو ثابت ہوا۔ میں جان چکا تھا کہ اب فاطمہ اور احتشام کی شادی ناممکنات میں سے ہے۔ میں نے ہیر رانجھا کی اس کہانی میں کیدو کا کردار بڑی مہارت سے ادا کیا تھا اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی تھی مگر نہیں شاید ابھی میرے لیے کچھ انعامات باقی تھے جو اگلے دن میرے حصے میں آنے تھے۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ اگلے دن پورے خاندان کے سامنے فاطمہ نے احتشام کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا، نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا اور وہ بھی علی الاعلان سب لوگوں کے سامنے۔ مجھے جو سکتہ ہونا تھا، وہ تو ہوا کیونکہ میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کرے گی اور وہ بھی اتنا فوری اور سب کے سامنے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کے بارے میں ایک دن پہلے میں نے سوچا تک نہیں تھا مگر اس وقت جب سب کے سامنے اس نے مجھ سے کہا۔

''اظفر، تم مجھ سے شادی کرو گے نا؟ تم تو مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں جانتی ہوں، تم دوسروں سے مختلف ہو۔ تم احتشام نہیں ہو۔'' پھر میں نے احتشام کے چہرے پر پھیلنے والی تاریکی دیکھی اور اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں سے اپنے لیے ایک ایسے اعتماد کو دیکھا جو پہلے نہیں تھا تو بے اختیار میں نے سر ہلا دیا۔

آپ خود ہی سوچیں اگر وہ لڑکی جس سے بندہ محبت کرتا ہو، جس سے شادی کی خواہش رکھتا ہو اور وہ آپ کو بری طرح دھتکار دیتی ہو، کسی طرح بھی اس سے شادی کا کوئی امکان آپ کو نظر نہیں آتا اور پھر ایک دن وہی لڑکی بہتے آنسوؤں کے ساتھ بھری محفل میں آپ کو اپنا کہے اور آپ پر اپنے اعتماد کا اظہار کرے۔ آپ کو دوسروں سے مختلف کہے اور پھر اپنے سابقہ منگیتر کی طرح نہ ہونے کا بھی کہہ دے اور پھر شادی کی خواہش کا اظہار

کرے تو آپ کے پاس کیا راہ فرار رہ جاتی ہے۔کم از کم مجھے تو اس وقت فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آئی یا آپ یہ سمجھ لیں کہ میں فرار ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔میرے پاس ہمیشہ کے لیے فاطمہ کا دل اور وجود جیتنے کا موقع آیا تھا میں اسے کیوں گنواتا۔میرے پاس پورے خاندان میں ہیرو بننے کا موقع آیا تھا تو میں اسے ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔

آدھے گھنٹے کے اندر میرے ماں باپ کی ناپسندیدگی اور ناراضگی کے باوجود فاطمہ کے ساتھ وہیں میرا نکاح ہو گیا اور پھر رخصتی بھی۔ابو شروع میں ناراض تھے پھر چچا نے انھیں اکیلے میں لے جا کر شاید ان کی منت سماجت کی ہو گی۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ واپس آئے تو پہلے کی طرح اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے بجائے خاموش رہے اور میری امی کو کہنے لگے کہ یہ شادی ہو جانے دیں مگر میری امی نے جتنا بولنا چاہا، بولتی رہیں اور جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ وہ یہ شادی نہیں روک سکتی تھیں تو وہ اٹھ کر گھر چلی گئیں۔ابو نے اس وقت تو یہ شادی ہو جانے دی اور فاطمہ کو بخوشی بہو کے طور پر قبول کر لیا مگر پتا نہیں کیوں، اگلے کئی ماہ تک وہ مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہے۔چند ماہ گزرے تو وہ نارمل ہو گئے تھے۔آپ تو جانتے ہی ہیں اس طرح کی شادی پر ماں باپ کا ردعمل کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

فاطمہ کا حق مہر چچا نواز نے دس لاکھ طے کیا اور میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔میں نے بخوشی یہ حق مہر ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔وہ بے چارے خوف زدہ ہوں گے کہ ان کی بیٹی جس طرح کے حالات سے گزری تھی۔بعد میں، میں کہیں اس کو چھوڑ نہ دوں مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔میں کوئی بے وقوف نہیں تھا جو کفران نعمت کرتا۔

فاطمہ سے شادی کیسے بھی حالات میں کیوں نہ ہوئی ہو مگر وہ میرے لیے ایک آئیڈیل بیوی ثابت ہوئی۔ایک ایسی بیوی جس کی نظروں میں، میں دیوتا سے کم نہ تھا۔اس کا بس چلتا تو وہ اپنی جان بھی مجھ پر قربان کر دیتی۔بقول اس کے میں نے اس پر احسان ہی اتنا بڑا کیا تھا۔وہ دن میں کئی بار مجھ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتی رہتی۔اپنی ممنونیت کا احساس دلاتی رہتی اور پھر جب میں اس سے یہ کہتا کہ وہ اب سب کچھ بھلا دے تو وہ کہتی۔

''نہیں اظفر، ہر بات بھلانے والی نہیں ہوتی۔کم از کم وہ سب کچھ تو ہرگز نہیں جو تم نے میرے ساتھ کیا۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں میرے لیے کتنی عقیدت ہوتی، میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔شاید وہ اس وقت اپنے وجود کو میرے قدموں کے نیچے بچھا دینا چاہتی ہو گی۔میرے حصے میں ایک ایسی عورت آ گئی تھی جو جدید دور کی دیو داسی تھی۔کیا کوئی دوسرا مرد اتنا خوش قسمت ہو سکتا ہے۔

وہ صرف مجھ پر ہی جان نثار کرنے کو تیار نہیں رہتی تھی بلکہ میرے باپ اور بہنوں کے لیے بھی اپنی بانہیں وا کیے رکھتی تھی۔میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری امی نے اس شادی کو قبول نہیں کیا تھا، چنانچہ انھوں نے فاطمہ کی زندگی کو عذاب بنا کر رکھ دیا۔میرے سامنے فاطمہ کے ساتھ ان کا سلوک جتنا برا ہوتا، میری عدم موجودگی میں اس سے بھی زیادہ برا ہوتا۔وہ فاطمہ کو ایسی ایسی باتیں سناتیں جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے فاطمہ کی برداشت پر حیرت ہوتی تھی جو بڑی خاموشی سے سب کچھ سن لیتی تھی اور پھر بھی امی کی خدمت پر کمربستہ رہتی تھی۔بعض دفعہ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو وہ میرے سامنے رونے لگتی اور امی کے الفاظ میرے سامنے دہراتی جو میرا خون کھولا دیتے۔امی اسے اس کے اغوا کے حوالے سے طعنے دیا کرتی تھیں اور یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ یہ اغوا میں نے کروایا تھا، فاطمہ اس معاملے میں بالکل بے قصور تھی مگر امی کو یہ کون

سمجھاتا۔ بعض دفعہ تو ساری ساری رات سو نہیں پاتا تھا کیونکہ امی کے الفاظ کچھ ایسے ہی ہوتے تھے۔

پھر میرا امی کے ساتھ جھگڑا ہوتا اور امی ان ساری باتوں سے مکر جاتیں اور فاطمہ...... وہ اتنی خوفزدہ ہوتی تھی کہ وہ امی کے سامنے ان کی کسی بات کی تردید نہ کرتی بلکہ یہی کہتی کہ انھوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ یہ سلسلہ صرف امی تک محدود رہتا تو شاید میں پھر بھی کسی نہ کسی طرح صبر کر لیتا مگر میری بہنیں بھی ایسی باتوں میں پیش پیش تھیں۔ میرے سامنے وہ کوئی بات نہ کرتیں مگر میری عدم موجودگی میں وہ فاطمہ کو ہر طرح سے ذلیل کرنے کی کوشش کرتی رہتیں اور وہ...... وہ پھر بھی ان کی خاطر مدارت کرتی رہتی، صرف اس لیے کہ وہ میری بہنیں تھیں اور فاطمہ میری احسان مند تھی۔ اسے مجھ سے منسوب ہر چیز سے محبت تھی۔ بعض دفعہ تو مجھے شرمندگی ہوتی کہ میں نے آخر کیوں......؟

اسی پچھتاوے کو کم کرنے کے لیے میں نے اپنا گھر اس کے نام کر دیا۔ اس رات بھی وہ میری امی کی کچھ باتوں سے دل گرفتہ تھی پھر روتے روتے وہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں اسے Console کرنے کے لیے اس کے پاس آ گیا۔ وہ مجھ سے بات کرنے لگی اور بات کرتے کرتے اس نے کہا۔

''جب میری منگنی ہوئی تھی، اختشام کے ساتھ تو ان دنوں ایک بار اختشام نے میری امی سے کہا تھا کہ وہ باہر سے پڑھ کر واپس آنے کے بعد اپنا گھر بنائے گا جسے وہ میرے نام کر دے گا۔ جب امی نے مجھے یہ بات بتائی تو میں نے مذاق میں بات اڑا دی مگر بعد میں جب میں نے سوچا کہ ایک الگ اور اپنا گھر کتنی خوشی اور سکون کا باعث ہوتا ہے تو مجھے اختشام پر بہت......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور میرے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ آخر وہ کیا کہتے کہتے رکی تھی۔

''میرے ساتھ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا اور اختشام میرے ساتھ یہ سب نہ کرتا تو شاید آج میرا بھی اپنا ایک گھر ہوتا'' اس نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ ''اس گھر سے بھی بڑا...... پھر کوئی اس طرح میری تذلیل نہیں کر سکتا تھا۔'' وہ یک دم کہہ کر تیزی سے میرے پاس سے چلی گئی اور جا کر بیڈ پر لیٹ گئی مگر میرے اوپر ایک قیامت گزر رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار میں نے اختشام کا ذکر اس کے منہ سے اس طرح کسی حسرت سے منسوب ہو کر سنا تھا ورنہ وہ اگر اختشام کا ذکر کرتی تھی تو برے لفظوں میں ہی مگر اس رات اس نے مجھے ہولا دیا تھا۔

آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی تھی۔ کیا یہ کہ جو کچھ اختشام اس کے لیے کر سکتا تھا، وہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس نے یہ سوچا ہی کیوں تھا۔ اختشام کا موازنہ کیوں کیا تھا اس نے میرے ساتھ؟ میرے اندر تو جیسے ایک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ بیڈ پر سو چکی تھی اور میں سگریٹ پھونک پھونک کر کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر میں نے اسے نیند سے جگایا اور اسے بتا دیا کہ میں اپنا گھر اس کے نام کر رہا ہوں، اس نے انکار کر دیا مگر میں ایک بار جو طے کر لیتا تھا، وہی کرتا تھا۔ میں نے اس رات اس سے بہت سے وعدے کیے تھے، شاید لاشعوری طور پر میں خود کو اختشام سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر اگلے کچھ سالوں میں، میں بالکل بدل کر رہ گیا یا آپ یہ کہہ لیں کہ فاطمہ نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ گھر کے علاوہ ہر چیز میری زندگی سے نکل گئی۔ ایک اچھی بیوی کی سب سے بڑی خوبی یہی تو ہوتی ہے کہ وہ شوہر کو گھر کے علاوہ سب کچھ بھلا دیتی ہے اور فاطمہ ایک اچھی بیوی تھی۔ میں جو دوستوں کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کا عادی تھا، آہستہ آہستہ میں نے سارے دوست چھوڑ دیے۔ میرے لیے فاطمہ، میرے بچے اور میرا گھر ہی سب کچھ تھا۔

میں اپنے والدین اور بہنوں تک کو فراموش کر چکا ہوں اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ وہ لوگ فاطمہ کی عزت نہیں کرتے اور جو فاطمہ کی عزت نہیں کرتا، اس سے میں کوئی تعلق رکھنے پر تیار نہیں ہوں۔

فاطمہ کے نام میں نے صرف گھر ہی نہیں کیا اور بھی بہت کچھ کیا، نہ صرف اس کے نام بلکہ اپنے بچوں کے نام بھی۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ فاطمہ ہر گزرتے سال کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ میری احسان مند ہوتی گئی۔ اس کی نظروں میں میرا مقام اور بڑھتا گیا۔ وہ مجھے ایک ایسا شوہر سمجھتی ہے جو اس کے لیے اللہ کا خاص انعام ہے اور میں نے اپنے ہر عمل سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ دولت اور جائیداد کے بدلے اگر کسی کا دل اس طرح جیت لیا جائے کہ وہ تاعمر آپ کا غلام بن جائے تو سودا برا تو نہیں ہے پھر چیزیں میرے نام رہیں یا اس کے، کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم دونوں میں علیحدگی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ فاطمہ مجھ سے عشق کرتی ہے، اس نے مجھے دیوتا کا درجہ دیا ہوا ہے، احسان مند ہے وہ میری۔ میں نے اسے اتنی زنجیروں میں باندھ رکھا ہے کہ وہ چاہے بھی تو خود کو آزاد نہیں کر سکتی اور وہ خود کو آزاد کروانا بھی کیوں چاہے گی۔

تو اب تو آپ جان ہی گئے ہیں نا کہ میں نے اس پر کیا احسان کیا ہے اور یہ کہ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں کہ مرد عورت سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے اور عورت لاکھ چاہے مگر ذہانت کے معاملے میں وہ کسی بھی طرح مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ خود ہی سوچیں، میں نے ہر بازی، ہر داؤ کتنی مہارت سے لگایا، اتنی مہارت سے کہ آج پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی فاطمہ کو احساس تک نہیں ہو سکا کہ وہ جس کی بیوی بن کر ہر وقت اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے، اس نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ وہ جس کے ہر وقت گن گاتی رہتی ہے، اس نے اسے کس طرح مات دی ہے۔ پندرہ سال گزرنے کے باوجود وہ کچھ نہیں جان سکی اور باقی زندگی بھی وہ اسی طرح میرے ساتھ ہنسی خوشی گزار دے گی، میرے گن گاتے گاتے۔

اب آپ ہی بتائیں، جب وہ اکثر عورت کی عقل مندی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بولتی رہتی ہے تو کیا مجھے اس پر ہنسی نہیں آئے گی۔ عورت اور عقل مندی......اور پھر مرد سے زیادہ عقل مند۔ ہے نا، ہنسنے والی بات۔

میں جانتا ہوں، آپ اگر مرد ہیں تو میری طرح ہنس رہے ہوں گے اور اگر عورت ہیں تو اس وقت سکتے کے عالم میں بیٹھی ہوں گی اور شاید یہ کہانی پڑھنے کے بعد اگلے ماہ خطوط کی محفل میں اس پر تنقید کے ڈونگرے برسائیں گی۔ میں جانتا ہوں، آپ ایسا ضرور کریں گی۔ وہ کیا کہتے ہیں کھسیانی بلی۔ چلیں خیر، اس بات کو چھوڑتے ہیں کہ عورت ہونے کی حیثیت سے آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

ہم بات کرتے ہیں فاطمہ کی۔ فاطمہ جو میری بیوی ہے اور جس سے مجھے محبت ہے، اتنی محبت کہ میں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو گیا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یقین کریں، فاطمہ سے مجھے واقعی میں محبت ہے مگر اس محبت کے باوجود میں یہ ماننے پر تیار نہیں کہ عورت مرد سے زیادہ عقل مند ہوتی ہے۔

مرد ہر بازی دماغ سے کھیلتا ہے، بس کبھی کبھار کوئی ایک بازی ایسی ہوتی ہے جسے وہ دل سے کھیلتا ہے اور جس بازی کو وہ دل سے کھیلتا ہے، اس میں مات کبھی نہیں کھاتا کیونکہ وہ بازی انا کی بازی ہوتی ہے پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ تو آپ سب جانتے ہی ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟



ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے شوہر کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئی ہوں، صرف اس لیے تاکہ وہ اخبار لپیٹ کر معمول کے مطابق میری ایک بات پر قہقہہ مار کر ہنس سکے۔

پچھلے پندرہ سال سے یہی ہو رہا ہے۔ میں جتنی دفعہ یہ جملہ دہراتی ہوں، وہ اتنی ہی بار اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ میرے سامنے وہ میری کہی ہوئی اس بات پر ہنس ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے، اس کے بعد اسے لمبی چوڑی وضاحتوں سے گزرنا پڑے گا اس لیے وہ ہمیشہ میرے جانے کے بعد ہی ہنستا ہے اور میں بھی یہ بات کہنے کے بعد اس کے پاس سے فوراً اٹھ جاتی ہوں تاکہ وہ جی کھول کر میری بات پر ہنس سکے۔

ہو سکتا ہے، آپ لوگوں کا خیال ہو کہ شاید میں اپنے شوہر کو کوئی لطیفہ وغیرہ سناتی ہوں جو اسے اتنا پسند آتا ہے کہ وہ ہر بار ہنستا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو خود سوچنا چاہیے۔ کیا شوہر بیویوں کے سنائے ہوئے لطیفوں پر ہنستے ہیں؟ میرا خیال ہے، ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ بار بار ایک ہی لطیفے پر ہنسی کیسے آ سکتی ہے اس لیے واضح کر دوں کہ میں اسے کوئی لطیفہ نہیں سناتی لیکن میرا خیال ہے کہ میرے شوہر کو میری بات کسی لطیفے سے کم نہیں لگتی ہوگی۔

اب آپ یقیناً یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہے ہوں گے کہ میں اپنے شوہر سے ایسی کون سی بات کہتی ہوں جس پر اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے تو چلیں، آپ کو بتا ہی دیتی ہوں۔

میں نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے شوہر سے کہا تھا۔

''خیر اس میں تو کوئی شک نہیں کہ عورت، مرد سے زیادہ عقل مند ہوتی ہے۔'' میرا شوہر اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا اور یہ بات ایک خبر سننے کے بعد میں نے اپنے تبصرہ میں کہی تھی۔ میں اس وقت نیل فائل سے اپنے ناخنوں کو رگڑ رہی تھی اور اس کے ساتھ کن انکھیوں سے میں اپنے شوہر کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

میرے جملے پر ہمیشہ کی طرح اس نے محظوظ ہو کر مجھے دیکھا اور پھر کافی دیر وہ میرے چہرے کو ہی دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں میری خوبصورتی کو سراہنے کے ساتھ ساتھ یقیناً اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کے لیے بے تحاشا کوشش کر رہا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ میں یہ بات کہتی اور وہ اپنی ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میرا چہرہ دیکھنے لگتا اور پھر کافی دیر میرا چہرہ دیکھتا رہتا پھر مجھے اس پر ترس آ جاتا اور میں اس کے پاس سے اٹھ جاتی تاکہ وہ چند منٹ اچھی طرح ہنس لے۔

آپ لوگ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میں بھی عورتوں کی نام نہاد برتری کی قائل، عورتوں کے کسی گروپ سے تعلق رکھتی ہوں۔ جو بات بے بات عورتوں کی آزادی، پھر برابری اور پھر برتری کے حوالے سے بیان دیتی رہتی ہیں۔ آپ اگر یہ سوچ رہے ہیں تو غلط سوچ رہے ہیں۔ میں ایک مکمل ہاؤس وائف ہوں۔ اپنے گھر، بچوں اور شوہر کے سوا مجھے اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے میری زندگی کا دائرہ کار خاصا محدود ہے۔

ہو سکتا ہے، اب آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ پھر میں ان عورتوں میں سے ہوں گی جنہیں شوہر کی بے التفاتی اور بے رخی کی شکایت رہتی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے شوہروں سے بحث میں الجھی رہتی ہیں۔ آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو ایک بار پھر غلط سوچ رہے ہیں۔ مجھے شوہر سے بحث کرنے کی

عادت ہے، نہ دلچسپی اور نہ ہی کبھی اس کی ضرورت پیش آئی ہے کیونکہ میرا شوہر آئیڈیل نہ سہی مگر پھر بھی شوہروں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے جو بہت نایاب ہوتی ہے۔

اظفر کے لیے فیکٹری اور گھر کے درمیان اور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جو اسے اپنی جانب کھینچ سکے۔ صبح ٹھیک نو بجے وہ گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو ٹھیک آٹھ بجے وہ دوبارہ گھر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ٹائمنگ صرف انہی دنوں کچھ بدلتی ہے، جب فیکٹری میں کام زیادہ ہو اور ایسا صرف سال کے کچھ خاص مہینوں میں ہی ہوتا ہے۔ گھر آنے کے بعد اس کا سارا وقت میرے اور میرے بچوں کے لیے ہوتا ہے۔

شادی سے پہلے اس کے دوستوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ شادی کے بعد ان پندرہ سالوں میں، میں نے جو اہم کام کیے ہیں، ان میں اظفر کے دوستوں سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ اس وقت اظفر کا کوئی دوست نہیں ہے، کاروباری دوستوں کے علاوہ...... اور یقیناً کاروباری دوستوں کے ساتھ آپ اپنا فارغ وقت گزارنا پسند نہیں کرتے۔ اظفر کی دوستیاں چھڑوانے میں مجھے وقت لگا لیکن بہر حال میں نے یہ کام کیا اور یہ کام کرنے میں مجھے کچھ ایسی حرکتیں بھی کرنی پڑیں جو شاید کسی دوسرے مرد سے شادی کی صورت میں، میں کبھی نہ کرتی۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔

تو میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ میں ان عورتوں میں بھی شامل نہیں ہوں جنہیں شوہر کی بے التفاتی کا گلہ ہو تو پھر ایسا بیان؟ اس کی ایک وجہ ہے اور جب میں آپ کو وہ وجہ بتاؤں گی تو پھر مرد ہونے کے باوجود آپ میرے بیان پر یقین کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگائیں گے۔

میں اظفر کے ساتھ شادی کر کے بہت خوش اور مطمئن ہوں اور مجھے اظفر سے شادی کرنے سے نفرت تھی پھر بھی یہ جان کر آپ کو حیرت ہو گی کہ یہ شادی میرے اصرار پر ہوئی تھی۔ نہیں...... یہ لو میرج نہیں تھی مگر اظفر مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا، ہاں مگر جب میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتی ہوں، آپ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے ہوں گے تو پھر آئیں ہر چیز کو ذرا تفصیلاً دیکھتے ہیں۔

✡......✪......✡

میرے والد ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ ہی رہتے تھے بلکہ اب بھی وہ ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور ان کی طرح میرے سارے تایا بھی سرکاری ملازم تھے، ہاں البتہ سب سے بڑے تایا نے سرکاری ملازمت نہیں کی بلکہ اپنا بزنس کیا اور اس بزنس میں کامیاب ہونے کے لیے وہ سارے ہتھکنڈے اور حربے استعمال کیے جو میرے والد اور دوسرے تایا کبھی استعمال نہیں کر سکے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہوتا ہے، میرے تایا نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی اور اس ترقی کے بعد ان کے حالات ہی نہیں نظریں اور ذہنیت بھی تبدیل ہوگئی۔

میرے بچپن میں ہی وہ جوائنٹ فیملی سسٹم چھوڑ کر اپنے الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ ان کے اس طرح چلے جانے کا ان کے علاوہ سب کو ملال ہوا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ نارمل ہوتا گیا۔

میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ مجھ سے چھوٹا طلحہ تھا اور پھر تین بہنیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے تا کہ میرے والد ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے، نہ صرف ملازم بلکہ ''ایماندار ملازم'' اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اور میرے گھر والوں نے خاصی مشکل زندگی گزاری لیکن اس مشکل یا تنگ دستی کی زندگی نے ہماری ویلیوز ختم نہیں کیں، نہ ہی ہم میں مایوسی اور ڈپریشن جیسی چیزوں کو جنم دیا۔ ہمارے والدین نے ہمیں تنگ دستی کے ساتھ اچھا خاصا ایڈجسٹ کر دیا تھا۔

اس زمانے میں ہماری سب سے بڑی دولت ہماری تعلیم تھی اور کم از کم اس معاملے میں ہم بڑے سے بڑے دولت مند کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میرے والدین شاید زندگی کی دوسری آسائشات ہمیں دینے کے لیے جدوجہد نہ کر سکے لیکن انھوں نے تعلیم کے معاملے میں ہمیں کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ جتنا ان سے ہو سکا، وہ ہماری تعلیم پر خرچ کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہم لوگ اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے لیے دیکھے جانے والے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کر سکیں۔ مجھے چھوڑ کر ان کی باقی ساری اولاد کے لیے یہ خیال بالکل ٹھیک ثابت ہوا۔ میرا بھائی آج کل امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے اور میری سب سے چھوٹی بہن اسی کے پاس سرجری میں اسپیشلائزیشن کر رہی ہے۔ باقی دو بہنوں میں سے ایک مقامی کالج کی وائس پرنسپل ہے اور دوسری ماحولیات کے بارے میں ایک بین الاقوامی تنظیم کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر منسلک ہے۔

اپنے والدین کی ساری اولاد میں سے صرف میں ہوں جو ماسٹرز نہیں کر سکی۔ شاید میرے حوالے سے میرے والدین نے سب سے زیادہ خواب دیکھے ہوں گے مگر بعض دفعہ خواب صرف خواب ہی رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر میری زندگی میں وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو شاید میں بھی اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرف کسی نہ کسی بڑے عہدے پر کام کر رہی ہوتی مگر خیر...... ایسا نہیں ہے کہ میں پچھتاوؤں کا شکار ہوں، پچھتاوا تو آپ کو تب ہوتا ہے، جب آپ نے زندگی میں بہت سی غلطیاں یا حماقتیں کی ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں میری کسی غلطی یا حماقت کا کوئی دخل نہیں تھا اس لیے کسی پچھتاوے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں مگر بعض دفعہ تھوڑی بہت اداسی ضرور ہوتی ہے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ مالی مشکلات کے باوجود ہم لوگ ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے، جب ہماری زندگی میں ایک طوفان آیا تھا،

اظفر کی صورت میں۔

ان دنوں میں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہی تھی اور میری احتشام کے ساتھ نئی نئی منگنی ہوئی تھی۔ آپ یک دم حیران ہو گئے ہیں کہ ابھی میں اظفر کا ذکر کر رہی تھی اور اب میں احتشام پر پہنچ گئی ہوں۔ دراصل مجھے پہلے ہی آپ کو احتشام سے متعارف کروا دینا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے تا کہ ہم لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے۔ احتشام میرے چھوٹے تایا کا بیٹا تھا۔ ہم لوگ بچپن سے ایک ساتھ رہتے آ رہے تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے تین سال بڑا تھا مگر اس کے باوجود ہم دونوں میں کمال انڈراسٹینڈنگ تھی بلکہ شاید ہم سب کزنز کی آپس میں بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ وہ اسٹڈیز میں خاندان میں سب سے اچھا تھا اور یہ اس کی سب سے بڑی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ سراہا جاتا تھا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ بہت خوبصورت نہ سہی مگر بہت برا بھی نہیں تھا۔ خوش لباسی اس کی ایک اور اہم خصوصیت تھی مگر مجھے اس کی جو بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ وہ سنجیدگی اور کم گوئی تھی۔ میری طرح اسے بھی اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، خاص طور پر اکنامکس سے متعلق کیونکہ یہ اس کا مضمون تھا۔ میری طرح وہ بھی بہت اچھے آرٹیکلز لکھا کرتا تھا لیکن شاید ہم میں سب سے بڑی مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ ہم دونوں ڈیبیٹر تھے۔ دونوں اچھے ڈیبیٹر تھے مگر میں نے ڈیبیٹس میں اتنے جھنڈے نہیں گاڑے تھے، جتنے احتشام نے گاڑے تھے، وہ مجھ سے بہت بہتر ڈیبیٹر تھا۔

جب دو لوگوں میں اتنی بہت سی خصوصیات مشترکہ ہوں تو پھر انھیں ان کا احساس ہو یا نہ ہو، دوسرے لوگوں کو ضرور ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ احتشام نے شان دار نمبروں کے ساتھ اکنامکس میں ماسٹرز کیا اور پھر فوراً ہی اسے بنک میں ایک بہت اچھی جاب مل گئی۔

جاب ملنے کے چند ہی دنوں بعد اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس کی امی میرا رشتہ مانگنے کے لیے ہمارے گھر آ گئیں۔ گھر کیا آپ یہی سمجھیں، ہمارے حصے میں آ گئیں۔ میرے لیے یہ ایک حیران کن بات تھی۔ احتشام کے بارے میں، میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا مگر تائی نے امی کو بتایا تھا کہ وہ احتشام کی خواہش پر یہ رشتہ لے کر آئی ہیں۔ میرے والدین نے اسی وقت مجھ سے اس رشتے کے بارے میں پوچھا۔ مجھے یقیناً کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اپنی رضامندی دے دی، چنانچہ احتشام سے میری نسبت طے کر دی گئی اور یہ میری زندگی کے خوشگوار ترین واقعات میں سے ایک تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ کسی کے ساتھ منسوب ہو جانے کے بعد آپ کی اس شخص کے بارے میں فیلنگز بالکل بدل جاتی ہیں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

میں یہ نہیں جانتی کہ احتشام کو مجھ سے محبت کب ہوئی مگر مجھے احتشام سے محبت منگنی کے بعد ہوئی اور میرا خیال ہے، یہ محبت احتشام کی محبت سے زیادہ شدید تھی۔ منگنی کے بعد میرا اور احتشام کا آپس میں میل جول تقریباً ختم ہو گیا کیونکہ نہ تو شادی سے پہلے اس طرح کا میل جول ہمیں پسند تھا، نہ ہی یہ ہماری خاندانی روایات کے مطابق تھا۔ میں اس سے پردہ تو نہیں کرتی تھی مگر کوشش کرتی تھی کہ جہاں وہ ہو، وہاں جانے سے گریز کروں۔ یہی سب وہ بھی کرتا تھا مگر اگر کبھی آمنا سامنا ہو ہی جاتا تو ہم دونوں بڑے مہذب انداز میں ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے اور پھر اپنی راہ ہو لیتے۔

زندگی بڑے پرسکون انداز میں گزر رہی تھی۔ ایم اے کے فوراً بعد میری شادی ہو جانی تھی کیونکہ احتشام کو ایم فل کے لیے بیرون ملک ایک سکالرشپ ملا تھا اور وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ان دنوں میں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کچھ اور پلان کر

رہے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ پلان کرتا ہے، وہی دراصل آپ کی تقدیر ہوتی ہے اور اس تقدیر کے سامنے ہم سب بے بس ہوتے ہیں۔ خبر میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں ان دنوں احتشام کے ساتھ اپنی آنے والی زندگی کے منصوبے بنایا کرتی تھی کیونکہ میرے تو وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ کوئی چیز میرے اور احتشام کے درمیان رکاوٹ بن سکتی ہے مگر اظفر کی صورت میں وہ رکاوٹ سامنے آ ہی گئی۔

میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میرے سب سے بڑے تایا بہت امیر تھے اور وہ میرے بچپن میں ہی جوائنٹ فیملی سسٹم سے الگ ہو گئے تھے۔ اظفر میرے انہی تایا کا بیٹا تھا، چونکہ وہ بچپن میں ہی اپنے الگ گھر شفٹ ہو گیا تھا اس لیے بہت کم ہی وہ ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ اگر آتا بھی تو سارا وقت بڑی تائی کے پاس بیٹھا رہتا۔ ہم سب کزنز اس کے جانے کے بعد اس کا خاصا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ہمیں اس کی وضع قطع اور عادت کچھ ایسی ہی احمقانہ لگتی تھی۔ تائی امی کا سارا غرور ان کے بیٹے میں جھلکتا تھا۔ تائی امی کو کبھی بھی ہم لوگ اچھے نہیں لگتے تھے۔ تایا کے ساتھ وہ بہت کم ہی حویلی میں آتی تھیں اور اگر آتی تھیں تو ہر بار کسی نہ کسی چیز پر اعتراض ضرور کرتیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ تایا کو وہاں سے لے جائیں اور اکثر وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہتی تھیں۔

ہر بار وہ جب بھی آتیں، حویلی کی کسی نہ کسی چیز میں مین میخ ضرور نکالتیں اور ان کی باتیں میری امی سمیت دونوں تائیوں کا دل جلا دیتی تھیں۔

مجھے یاد ہے، ایک بار وہ ہمارے ہاں آئی تھیں اور ہم نے انھیں ہمیشہ کی طرح ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا مگر انھوں نے صوفے پر بیٹھتے ہی صوفے کے گھسے ہوئے کپڑے کو دیکھ کر کہا۔

''صوفیہ، تم نیا صوفہ کیوں نہیں خرید لیتیں کچھ زیادہ نہیں بس آٹھ دس ہزار ہی کی بات ہے۔'' میری امی ان کی بات پر جل کر رہ گئی تھیں کیونکہ وہ جتنی رقم کی بات کر رہی تھیں، اتنی رقم تو میرے ابو کو تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی پھر وہ جتنی دیر ہمارے ہاں بیٹھی رہیں، میری امی کو شہر کے فرنیچر کی بڑی بڑی دکانوں کے نام بتاتی رہیں جہاں سے جدید ڈیزائن کا انتہائی معیاری اور ''مہنگا'' صوفہ بڑے آرام سے خریدا جا سکتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میری امی نے جوں توں کر کے صوفے کا کپڑا تبدیل کروا لیا تھا مگر اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ اگلے دو ماہ تک ہم لوگ گوشت نہیں کھا پائے تھے۔

مجھے بڑی تائی سے ان کی ایسی ہی حرکتوں کی وجہ سے چڑ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بہت صاف گو ہیں اسی لیے وہ یہ حق رکھتی ہیں کہ جس کو جب جی چاہے جو مرضی چاہے کہہ دیں اور پھر اگر ان کی بات پر کوئی ناراض ہوتا تو انھیں اس پر بھی اعتراض ہوتا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی سچی بات پر کسی کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خود وہ کسی کی سچی بات سننے کی روادار نہیں تھیں۔ کیونکہ اپنے بارے میں سچی باتوں کو وہ دوسروں کا بغض اور حسد قرار دیتی تھیں۔ اگرچہ وہ حویلی میں بہت کم آیا کرتی تھیں لیکن ہم سب لوگوں کے بارے میں ''سچ'' پھیلانے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔

اظفر ان کا بگڑا ہوا اکلوتا بیٹا تھا اور کسی کو بھی اس بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی کیونکہ بڑی تائی کی اولاد سلجھی ہوئی کسی طور بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اظفر بہت کم ہماری طرف آیا کرتا تھا۔ اس لیے اس سے میرا آمنا سامنا بھی بہت کم ہی ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اس سے میرا آمنا سامنا شادی وغیرہ جیسے مواقع پر ہی ہوتا تھا۔ بڑے تایا کی اولاد سے ملنے میں ویسے بھی ہمیں دلچسپی کم ہی تھی۔ اگرچہ وہ حویلی نہیں آتا تھا مگر اس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں ہم تک ضرور پہنچتی رہتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اسے پڑھائی میں دلچسپی نہیں ہے اور تایا اور تائی کی

''بھرپور کوشش'' کے باوجود اسے پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بی اے میں دوبار فیل بھی ہوا اور تیسری بار بھی وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

میرے کچھ کزن بھی اسی کالج میں پڑھتے تھے جس میں وہ پڑھتا تھا اور وہ اکثر بتاتے رہتے تھے کہ وہ کالج کے بجائے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح والی جگہوں پر زیادہ پایا جاتا ہے پھر پتا چلا کہ اس نے بی اے کے بعد تعلیم چھوڑ دی ہے اور تایا کے ساتھ فیکٹری جانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی سنا کہ تائی اس کے لیے لڑکیوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہیں۔

اگرچہ ہمارے خاندان میں رشتے باہر نہیں کیے جاتے تھے مگر اس روایت کو توڑنے کا فریضہ بھی تائی نے ہی سرانجام دیا۔ انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کی شادیاں خاندان سے باہر کیں اور جب انھوں نے یہ کیا تو خاندان یہ جان گیا کہ اب وہ بیٹے کی شادی بھی خاندان سے باہر ہی کریں گی اس لیے کسی نے اظفر کے ساتھ اپنی کسی بیٹی کا مقدر پھوڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ ''سعادت'' میرے حصے میں لکھی گئی ہے۔ اظفر سے میرا میل جول کس حد تک تھا، یہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں، اب ایسے میل جول کے باوجود بھی اسے مجھ سے عشق ہو گیا اور وہ بھی تب، جب کہ میری احتشام سے منگنی ہو چکی تھی تو آپ خود ہی ایسے شخص کی ذہنی ابتری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اظفر اکثر مجھے بتاتا رہتا کہ اسے مجھ سے محبت کب ہوئی تھی اور میں ہمیشہ سوچتی ہوں کہ کاش، میں اس دن کبھی اس کے سامنے نہ جاتی۔

یہ احتشام کے ساتھ منگنی کے کئی ہفتے بعد کا ذکر ہے، جب ایک دن میں سہ پہر کے وقت اپنے گھر سے نکل کر چھوٹے تایا کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ ہم سب کا دالان مشترکہ تھا اور ایک دوسرے کے حصوں میں جانے کے لیے ہمیں وہیں سے گزرنا پڑتا تھا۔ تایا کے گھر کی طرف جاتے جاتے اچانک میری نظر چھوٹے تایا کے برآمدے کی طرف اٹھی تھی اور وہاں میں نے اظفر کو کھڑا دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف متوجہ تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ ایسا بہت کم ہوتا کہ وہ حویلی آتا مگر بہرحال آج وہ وہاں کھڑا تھا اور نہ صرف کھڑا تھا بلکہ مجھے دیکھ بھی چکا تھا۔

میں نے پہلے تو اظفر کو نظر انداز کر کے گزرنا چاہا مگر پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، بڑی تائی بھی اظفر کے ساتھ آئی ہوں اور ظاہر ہے پھر تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ہمارے گھر بھی آئیں گے اور یوں نظر انداز کر کے گزر جانا مجھے خاصا مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اگر اظفر بڑی تائی سے اس کا ذکر کر دیتا تو کیونکہ بڑی تائی دوسروں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں اور ان کے بیٹے سے بعید نہیں تھا کہ وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا اس لیے میں نے اسے نظر انداز کرنے کا ارادہ ترک کیا اور اس کی طرف آ گئی۔ اس کے پاس آ کر میں نے اس کا حال احوال پوچھا اور پھر تائی کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ جان کر مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی کہ تائی تشریف نہیں لائیں، اس کا مطلب تھا کہ اب ان کی خاطر مدارات اور تنقید سے ہم لوگ بچے رہتے۔

مجھے اس وقت شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا، جب اظفر نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور وہ بھی مسکرا کر۔ اظفر ہمیشہ بہت روکھے انداز میں سب سے مخاطب ہوتا تھا اس لیے اس کا یہ نرم لہجہ مجھ سے ہضم نہیں ہوا پھر میں نے اسے یہ بات جتا دی کہ اس کے گھر ہمیشہ ہم لوگوں کو شادی کی دعوت پر ہی بلایا جاتا ہے، ویسے نہیں اور میں نے اظفر سے پوچھا تھا۔

''کیا آپ کی شادی ہے؟'' اس کے بعد اس کے چہرے پر بے پناہ شرمندگی ابھر آئی تھی اور میں اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں اس کی دعوت قبول کرنے کا کہہ کر تایا کے گھر چلی گئی۔

اس واقعے کے چند دن بعد اس وقت سب کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب تایا نے میلاد کی محفل اپنے گھر منعقد کروائی اور اس میں پورے خاندان کو انوائٹ کیا، یہ ایک ایسا عجیب واقعہ تھا جس نے پورے خاندان کو حیرت کے بہت سے غوطے دیے۔ تایا اور تائی نے اوّل تو کبھی میلاد کی محفل منعقد کروائی ہی نہیں تھی کیونکہ تائی کا خیال بلکہ فرمان تھا کہ عقیدت دل میں ہوتی ہے، اس کا اظہار ضروری نہیں ہوتا اور اگر کبھی انھوں نے ایسی کسی دعوت کا اہتمام کیا بھی تو اس میں ہمارے خاندان کو بلانے کی زحمت نہیں کی۔ وہ ایسی تقریبات میں صرف اپنے میکے والوں کو بلایا کرتی تھیں۔ اب یک دم جب سب کو اس تقریب کے لیے بصد اصرار بلایا گیا تو حیرت تو ہونی ہی تھی۔

اس حیرت میں اس وقت کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جب اظفر بھی تائی کے ساتھ اس تقریب کی دعوت دینے آیا اور اس نے میری اس دن کی بات جتاتے ہوئے کہا کہ اب تو مجھے اس کے گھر آنا ہی چاہیے۔

اظفر صاحب کی اس کایا پلٹ پر میں کافی حیران ہوئی تھی۔ کہاں یہ عالم کہ وہ بات کرنے پر تیار نہیں اور کہاں یہ عالم کہ اپنے گھر آنے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے ایک Good will gesture کے طور پر لیا اور اظفر سے یہی کہا کہ میں میلاد میں آؤں گی مگر میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان دنوں میرے سمسٹر ہو رہے تھے اور میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں پڑھائی کے علاوہ کسی اور جانب توجہ دیتی۔

مگر میرے لیے ابھی حیرانی کے بہت سے جھٹکے باقی تھے۔ میں میلاد والے دن اپنی ایک بہن کے ساتھ گھر پر ٹھہر گئی۔ امی کو تایا کے گھر گئے ابھی صرف ایک گھنٹا ہی ہوا تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھولنے پر میں نے اظفر صاحب کو وہاں موجود پایا۔

''آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں؟'' میرے دروازہ کھولتے ہی اس نے کہا تھا۔

مجھے اظفر کو دیکھ کر جتنی حیرت ہوئی تھی، اس کے سوال کو سن کر اس سے زیادہ حیرت ہوئی۔

''کیا یہ صرف یہ پوچھنے آیا ہے کہ میں میلاد پر کیوں نہیں آئی اور اگر ایسا ہے تو آخر کیوں؟'' اس سے پہلے کہ میں اپنے ذہن میں ابھرنے والا یہ سوال دہراتی میری بہن وہاں آ گئی۔

''میں گھر کے کسی کام کے لیے یہاں سے گزر رہا تھا، آپ دونوں کا خیال آیا تو پوچھنے چلا آیا۔'' اس نے سلمٰی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اظفر بھائی آپا کے تو سمسٹرز ہو رہے ہیں اور مجھے رات کے لیے کھانا پکانا تھا اس لیے میں نہیں آ سکی۔'' سلمٰی نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ وہ پھر زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں اور چلا گیا۔

''آپا، یہ اظفر بھائی کچھ عجیب سے نہیں ہو گئے، صرف ہمارے نہ آنے پر یہ پوچھنے آ گئے ہیں۔ حیرانی کی بات نہیں؟'' سلمٰی نے اندر جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کچھ فکر مند انداز میں اظفر کی اس حرکت کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

تیسرے دن میری فکر میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہو گیا، جب میں نے یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے بس اسٹاپ پر اسے اپنی گاڑی

سمیت موجود پایا۔

''میں ادھر سے گزر رہا تھا، آپ کو دیکھا تو رک گیا۔'' اس نے ایک بار پھر وہی جملہ دہرایا تھا۔ اظفر خود کو جتنا بامروت اور بالحاظ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اتنا بالحاظ اور بامروت نہیں تھا۔ آج تک اس سمیت اس کے گھر والوں نے کبھی ہمارے پورے خاندان پر لفٹ جیسی نوازش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب ایک دم ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ وہ اتنا مہذب بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اتنی بے وقوف اور کم عمر نہیں تھی کہ اس کی بات پر یقین کر لیتی اور واقعی یہ سمجھتی کہ وہ گزرتے گزرتے مجھے دیکھ کر رک گیا ہے۔ پہلی دفعہ میں نے یہ طے کیا کہ مجھے اس کے ساتھ اپنی گفتگو کا انداز بدلنا پڑے گا۔

میں بس اسٹاپ پر تماشا نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے خاموشی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی مگر اس وقت مجھے اس پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ میرا جی چاہا، میں اسے ایک جھانپڑ رسید کر کے اس کی طبیعت صاف کر دوں۔ وہ رستے میں مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میں اپنی ہوں ہاں کے ذریعے اس کی ان کوششوں پر پانی پھیرتی رہی۔

گھر پہنچنے پر میں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی کیونکہ اس طرح اس کا مجھے گھر کے باہر چھوڑ جانا کوئی مناسب بات نہیں تھی۔ وہ میری اس دعوت پر خاصا خوش نظر آیا تھا اسے اندر بلا کر میں اسے کمپنی دینے کے بجائے امی کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اب واقعی اس پر یہ جتا دینا چاہتی تھی کہ مجھے اس کی حرکت بہت بری لگی ہے کیونکہ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ آئندہ بھی اس طرح یونیورسٹی پہنچ جائے۔

میرا یہ رویہ بار آور ثابت ہوا تھا اور اظفر کو دوبارہ یونیورسٹی آنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میں اس کے ساتھ کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس طرح خواہ مخواہ خاندان میں فضول چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں اور یہ میرے لیے مناسب نہ ہوتا۔

اس واقعے کے بعد اظفر ہمارے گھر بھی نہیں آیا اور میرے لیے یہ بات بھی باعث اطمینان تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے دل یا دماغ میں اگر کوئی فضول بات تھی بھی تو میرے رویے سے ختم ہو گئی ہو گی، یہی وجہ تھی کہ ڈیڑھ ماہ کے بعد جب میں نے اسے چھوٹے تایا کی بیٹی کی مہندی کی تقریب میں دیکھا تو میں نے خاصی خوش دلی کے ساتھ اس کا حال احوال پوچھا۔ ظاہر ہے، میری اور اس کی کوئی دشمنی تو نہیں تھی کہ میں اس سے بات بھی نہ کرتی، نہ ہی اس نے کوئی ایسا کام کیا تھا جس پر اسے معاف نہ کیا جا سکتا۔ وہ ویسے بھی میرا کزن تھا۔

مگر میرا خیال ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ اب جب مجھے اس کا احساس ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ میں لوگوں کو پرکھنے میں خاصی غیر محتاط تھی۔ بہر حال اسی تقریب میں میں اپنی کزنز کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی، جب اظفر میرے پاس آیا۔

''فاطمہ، مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے؟'' اس نے بہت مہذب انداز میں کہا۔

''جی کیجئے۔'' میں نے بھی اسی روانی سے جواب دیا، وہ کچھ ہچکچایا۔

''یہاں نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے علیحدگی میں آپ سے بات کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔ میں چند لمحے سوچتی رہی اور پھر کندھے اچکا کر اس کے ساتھ چل پڑی ٹینٹوں کے پیچھے ایک سنسان جگہ پر جا کر اس نے مجھ سے جو بات کہی تھی، اس نے میرے پیروں تلے سے زمین غائب کروادی تھی۔ مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرے گا اور پھر شادی کی آفر بھی کر دے گا۔

چند لمحے تو میں اس کی بات سمجھ ہی نہیں پائی اور جب سمجھ سکی تو مجھے جیسے آگ لگ گئی۔

''مجھے تمہاری محبت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں احتشام کی منگیتر ہوں اور چند ماہ بعد ہماری شادی ہو جائے گی، میرے لیے یہی کافی ہے۔'' میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ وہ میری بات پر ایک دم غصے میں آ گیا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا اور ہوگا تو میرے مرنے کے بعد ہی ہوگا۔'' مجھے اس کی بات سن کر اور غصہ آیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر مر جاؤ۔'' میں نے خاصی بے رحمی سے کہا۔ میری بات نے اسے اور مشتعل کیا۔

''میں نے زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے اور وہ تم ہو اور تمہارا خیال ہے، میں تمہیں کسی اور سے منسوب ہونے دوں گا؟'' مجھے اس کی ہٹ دھرمی پر غصہ آیا۔

''یہ بات میں اگر احتشام سے کہہ دوں تو وہ بھی تمہیں شوٹ کر دے گا۔''

''اس سے پہلے میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ وہ کیا چیز ہے؟ آخر ہے ہی کیا اس میں؟'' اس کی بکواس مسلسل جاری تھی۔

''وہ ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہے، تم تو اس کے پاؤں کے جوتے کے برابر بھی نہیں ہو۔'' میں نے اپنی بات پر اس کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا مگر مجھے اس وقت اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شادی اگر کسی سے ہوگی تو مجھ سے ہوگی فاطمہ۔ یہ بات لکھ لو، چاہے تمہاری خوشی سے ہو یا زبردستی۔''

''اس سے پہلے میں خودکشی کر لوں گی۔'' اس کی باتیں اب میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں وہاں سے آنے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اور میں تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گا۔''

مجھے اس کی اس حرکت پر کرنٹ لگا تھا۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرے گا۔ اس وقت میرا دل چاہا، میرے پاس ایک پسٹل ہوتا اور میں اسے شوٹ کر دیتی۔ میں نے اس سے کہا۔

''میں تمہارے منہ پر تھپڑ مارنا نہیں چاہتی اس لیے میرا ہاتھ چھوڑ دو۔'' مگر میری بات پر اس نے میرا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اسے اور مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں لڑکیوں سے تھپڑ کھانا پسند بھی نہیں کرتا۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا ہاتھ واپس کھینچا مگر اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ میں کھول کر رہ گئی اور پھر ایک دم میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے اس کے ہاتھ کی پشت پر پوری قوت سے دانت گاڑ دیے۔ اس

وقت میں نے کسی لحاظ اور نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا، میں اسے زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانا چاہتی تھی۔ اس نے یک دم گھبرا کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تم میری توقع سے کہیں زیادہ ذلیل ہو۔'' میں اسے یہ کہہ کر وہاں سے چلی آئی۔

میرا خیال تھا، اس کے لیے اتنا ڈوز کافی ہوگا مگر وہ انتہائی ڈھیٹ ثابت ہوا۔ شادی کے باقی تمام فنکشنز میں وہ نہ صرف شامل ہوا بلکہ جہاں بھی اس کا مجھ سے سامنا ہوتا، وہ بڑی خوش دلی سے مسکراتا۔ میں نے اس واقعے کا گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ میں خاندان میں کسی تفرقے کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی مگر میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے جی بھر کے صلواتیں سناؤں، شاید تب ہی اس کو تھوڑی شرم محسوس ہو۔

شادی کے چند دن بعد تک میں اس واقعے سے خاصی ڈسٹرب رہی مگر شاید یہ پریشانی کا آغاز تھا کیونکہ آگے چل کر میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، وہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے زندگی میں بہت سے خود غرض اور گھٹیا لوگ دیکھے تھے مگر جس دن بڑے تایا اور تائی اظفر کا رشتہ میرے لیے لے کر آئے، اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ خود غرضی اور گھٹیا پن کی کوئی حد اور کوئی انتہا نہیں ہوتی، بس آدمی کا بے ضمیر ہونا شرط ہے۔ آپ خود سوچیے اگر آپ اپنے بیٹے کا رشتہ کسی ایسی لڑکی کے لیے لے کر جائیں جو پہلے ہی کسی سے منسوب ہو اور چند ماہ بعد اس کی شادی بھی ہونے والی ہو اور آپ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کریں صرف اپنے بیٹے کو خوش کرنے کے لیے تو وہ لڑکی آپ کے بارے میں کیا سوچ سکتی ہے۔

میں یہ سب کچھ جان کر جتنا شاکڈ ہوئی تھی، میرے ماں باپ اس سے زیادہ ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے میرے ابو تایا کی بات پر کچھ بول ہی نہیں سکے تھے، شاید انھیں یقین نہیں آیا ہوگا کہ جو کچھ وہ سن رہے تھے، وہ صحیح بھی تھا یا نہیں۔

''بھائی جان، میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ آپ جانتے ہیں نا کہ فاطمہ کی منگنی احتشام سے ہو چکی ہے۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میرے ابو نے بڑے تایا سے پوچھا۔ میں کچن میں موجود تھی اور وہاں سے تمام آوازوں کو سن سکتی تھی۔

''میں جانتا ہوں لیکن مجبور ہوں، اظفر کی خواہش ہے کہ فاطمہ کی شادی اس سے ہو۔'' تایا کا لہجہ کچھ دھیما تھا۔

''اگر اس کی ایسی کوئی خواہش تھی تو آپ لوگوں کو اس وقت بات کرنی چاہیے تھی، جب ہم لوگوں نے فاطمہ کا رشتہ ابھی کہیں طے نہیں کیا تھا۔ اس وقت تو بھابی جگہ جگہ فاطمہ کی برائیاں کیا کرتی تھیں۔ اب جب ہم اس کی شادی کرنے والے ہیں تو آپ لوگوں کو خیال آ گیا ہے کہ آپ کے بیٹے کو فاطمہ پسند ہے۔'' میری امی نے غصے میں ان سے کہا تھا۔

''تمھیں میری جس بات سے بھی تکلیف پہنچی ہو، میں اس کے لیے تم سے معذرت کرتی ہوں مگر یقین کرو، اظفر نے پہلے کبھی فاطمہ کا ذکر نہیں کیا ورنہ میں بڑی خوشی سے فاطمہ کو اپنی بہو بناتی۔'' میں نے پہلی بار تائی کے لہجے میں رعونت کے بجائے التجا دیکھی اور مجھے اس التجا سے بھی اتنی ہی گھن آئی جتنی ان کی رعونت سے آتی تھی۔

''جو بھی ہو، بہر حال فاطمہ احتشام سے منسوب ہے اور اس کی شادی وہیں ہوگی۔'' میں نے ابو کو کہتے سنا۔

''نواز، میں تمھارا بڑا بھائی ہوں اور بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے میں تمھارے سامنے اپنی جھولی پھیلا رہا ہوں، تمھیں کچھ تو احساس ہونا

چاہیے۔‘‘میں نے تایا کو گڑگڑاتے سنا تھا۔

’’بھائی جان، احساس صرف مجھے کیوں ہونا چاہیے کیا آپ کو احساس نہیں ہے کہ جو آپ چاہ رہے ہیں، وہ کتنی نامناسب بات ہے، احتشام بھی میرے بڑے بھائی کی اولاد ہے پھر میں اس کے ساتھ زیادتی کیسے کروں، آپ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں۔‘‘میں نے ابو کو پہلی بار بڑے تایا سے بلند آواز میں بات کرتے سنا۔

’’میں سب کچھ سمجھتا ہوں نواز مگر میں مجبور ہوں۔ اظفر میرا اکلوتا بیٹا ہے اور وہ اس رشتے پر بضد ہے۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ خودکشی کرلے گا۔ تم اس باپ کے جذبات سمجھ سکتے ہو جس کا ایک ہی بیٹا ہو۔‘‘

’’بھائی جان، میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں لیکن میں فاطمہ کی شادی اظفر سے نہیں کرسکتا۔ فاطمہ کے علاوہ اظفر میری جس بیٹی سے شادی کرنا چاہیے گا، میں بغیر کسی تامل کے اس کے ساتھ اس کی شادی کردوں گا۔‘‘

میں نے ابو کی بات پر تایا کو خاموش ہوتے دیکھا پھر اس کے بعد ان میں کیا باتیں ہوئیں، میں نہیں جانتی کیونکہ میں غصے کے عالم میں کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

تایا اور تائی بہت دیر تک ہمارے گھر بیٹھے رہے۔ جب وہ واپس گئے تو ہمارے گھر پر ایک عجیب سی اداسی طاری ہوگئی تھی۔ میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ امی مسلسل اظفر اور تائی تایا کے خلاف بلند آواز میں بول کر اپنا غصہ نکال رہی تھیں اور ابو الگ پریشانی کے عالم میں برآمدے کے چکر لگا رہے تھے۔ انھیں یقیناً اپنے بڑے بھائی کو خالی ہاتھ بھیجنے کا افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خودغرضی کا دکھ بھی ہوگا۔ میری بہنیں اور بھائی ایک عجیب سی خاموشی کے ساتھ اپنے سارے کام انجام دے رہے تھے اور میں اپنے دل میں اظفر کو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار گالی سے نواز رہی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اتنے واضح انکار کے بعد تایا اور تائی ہمارے گھر دوبارہ کبھی آئیں گے اور نہ ہی اظفر صاحب سے دوبارہ میرا سامنا ہوگا مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ اظفر کے بقول کچھ لوگ مستقل مزاج ہوتے ہیں، آپ مستقل مزاج کی جگہ ڈھیٹ کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں۔ میں ان دونوں کے بجائے ایک اور ’’موزوں‘‘ لفظ استعمال کرتی ہوں۔

مجھے یاد ہے، تایا اور تائی کے اس دن ہمارے گھر آنے کے بعد یہ چوتھا یا پانچواں دن تھا، جب اظفر میرے ڈیپارٹمنٹ آدھمکا تھا۔ میں کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد باہر نکلی اور میں نے اسے کوریڈور میں پایا۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے یقین نہیں ہوا کہ وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے۔ وہ مجھے ساکت دیکھ کر خود ہی میری طرف بڑھ آیا۔

اس وقت پہلی بار میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس شخص سے کیا کہوں آپ خود سوچئے میری جگہ آپ ہوں تو آپ کا ردعمل کیا ہوسکتا ہے۔ میں بھی غصے اور بے بسی کے عالم میں اسے اپنی طرف آتا دیکھتی رہی۔ میرے پاس آ کر اس نے کہا۔

’’میں جانتا ہوں، مجھے یہاں دیکھ کر تمھیں بہت غصہ آ رہا ہوگا مگر مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اسی لیے مجھے یہاں آنا

پڑا۔'' وہ میرے قریب آ کر اتنے مہذب انداز میں بات کر رہا تھا، جیسے میرے اور اس کے درمیان گہری دوستی ہو۔

''یہ وہی ضروری بات ہوگی جس کا جواب تمھارے ہاتھ پر ہے۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''کیا ہم ساری گفتگو یہیں کریں گے؟'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم مر جاؤ، میں تمہاری قبر پر آؤں گی تو باقی باتیں وہاں کر لیں گے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ اب بھی متاثر نہیں ہوا۔

''آج میں تم سے آخری بار چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ اس کے بعد تم دوبارہ کبھی مجھے نہیں دیکھو گی، یہ میرا وعدہ ہے اس لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم آخری بار میری چند باتیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کسی غصے کے بغیر سن لو۔'' اس نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے آؤ۔'' وہ میرے ساتھ یونیورسٹی کے لان میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ ''ہاں اب کہو۔'' میں نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''دیکھو فاطمہ، میں نہیں جانتا، محبت کے بارے میں تمھارے کیا نظریات ہیں مگر میرے نزدیک محبت بہت بڑی حقیقت ہے اور......'' میں نے بے زاری سے اس کی بات کاٹ دی۔

''اظفر صاحب، میں محبت کے بارے میں آپ سے کوئی لیکچر سننے نہیں آئی جس سے میرے علم میں اضافہ ہو، آپ مجھ سے ٹو دی پوائنٹ بات کریں۔'' وہ چند لمحے خاموش رہا۔

''میں نے اپنے والدین کو تمھارے گھر بھیجا تھا، کیا یہ میری سچی محبت کا ثبوت نہیں ہے۔''

''نہیں، یہ آپ کی کمینگی اور گھٹیا پن کا ثبوت ہے۔'' اس کا چہرہ دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ میرا جملہ اسے خاصا ناگوار گزرا ہے۔

''جو آدمی کسی لڑکی کو پسند کرنے کے بعد اس کے گھر اپنا رشتہ بھیجے تو کیا یہ اس کی شرافت کا ثبوت نہیں ہے؟''

''جو آدمی اپنے فرسٹ کزن کی منگیتر پر نظر رکھے اور اس پر ڈورے ڈالنے میں ناکام ہو کر اس کے گھر رشتہ بھیجے، وہ کم از کم میری ڈکشنری کے مطابق شریف نہیں کہلاتا۔'' میں نے اسے دو بدو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میرا کوئی فرسٹ کزن ہے، نہ میں تمھیں کسی کی منگیتر سمجھتا ہوں۔''

''اگر میں احتشام کی منگیتر کے بجائے اس کی بیوی ہوتی اور تمھارے بقول تمھیں مجھ سے محبت ہو جاتی تو کیا پھر بھی تم مجھے اسی طرح شادی کا پروپوزل دے رہے ہوتے؟''

''ہاں اگر مجھے تم سے اتنی محبت ہو جاتی، جتنی اب ہے تو میں ایسا ہی کرتا۔''

''بھئی، بہت ہی بے غیرت ہیں آپ...... بلکہ جتنا میں سوچ رہی تھی، اس سے زیادہ بے غیرت ہیں۔'' وہ بہت دیر تک سرخ چہرے کے ساتھ مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا۔

''میرے لیے یہ لفظ دوبارہ استعمال مت کرنا فاطمہ۔''

''ورنہ تم کیا کرو گے؟'' میں اس کے لہجے سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔

''میں جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ جس چیز سے محبت ہو، اسے آپ اپنے Possession (ملکیت) میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ برداشت نہیں کرتے کہ وہ چیز کسی دوسرے کے پاس چلی جائے۔''

''مگر میں کوئی چیز نہیں ہوں اور میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں جس سے مجھے محبت ہے۔''

''احتشام سے محبت ہے تمہیں؟ اس کے پاس جانا چاہتی ہو؟'' اس کے لہجے میں آگ تھی اور اس وقت میں جان نہیں پائی تھی کہ اس آگ کی لپیٹیں کہاں کہاں پہنچ سکتی ہیں۔

''ہاں، اسی کے پاس جانا چاہتی ہوں اور ہاں، مجھے اس سے محبت ہے۔''

''دنیا کا کوئی شخص تمہیں مجھ سے زیادہ نہیں چاہ سکتا۔''

''پھر بھی مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔'' میں جیسے ضد میں آ گئی تھی۔

''میں پوری دنیا تمہارے قدموں میں لا کر پھینک سکتا ہوں۔''

''میں ایسی ہر چیز کو ٹھوکر مار دوں گی۔''

''احتشام تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔''

''مجھے اس سے کچھ چاہیے بھی نہیں، میرے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ میرے ساتھ ہو۔''

''جو لوگ محبت کو ٹھکرا دیتے ہیں، وہ بہت پچھتاتے ہیں۔''

''ہاں اسی لیے میں احتشام کی محبت کو ٹھکرا نہیں رہی۔''

''احتشام تم سے میرے جیسی محبت نہیں کر سکتا۔''

''وہ جیسی بھی محبت کرتا ہے، مجھے کافی ہے۔''

''میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی چیز کو اتنا چاہا ہو اور پھر بھی نہ پایا ہو۔''

''آج کے بعد تم کبھی کسی سے یہ نہیں کہہ پاؤ گے۔'' مجھے آج بھی اس کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ وہ یک دم خاموش ہو گیا تھا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ آج کے بعد میں دوبارہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ تم اس سارے واقعے کو میری ایک حماقت سمجھ کر بھول جانا اور میرے لیے اپنا دل صاف کر لینا۔ تم اگر میرے لیے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں رکھتیں تو مجھے تم پر زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تمہیں حق ہے، تم جس کو چاہو، اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر چنو۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیا ہے؟'' اس نے اتنی تیزی سے پینترا بدلا کہ میں ہکا بکا رہ گئی۔

''کیا چیز ہو تم اظفر، ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟ ابھی تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''میں بکواس کر رہا تھا، تم بھی اسے بکواس سمجھ کر بھول جاؤ'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گی۔

''میری طرف سے اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچی ہو تو اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ بھی کھڑا ہو گیا پھر اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

اس دن گھر واپسی پر میں بہت خوشگوار موڈ میں تھی۔ میرا خیال تھا، اب سارا مسئلہ حل ہو گیا ہے مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ بہر حال اس دن کم از کم مجھے یونہی لگا تھا۔ میں نے اپنی امی کو بھی اظفر سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور انھوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

رات کو تایا اور تائی ہمارے گھر آئے اور انھوں نے ابو اور امی سے اظفر اور اپنی طرف سے معذرت کی۔ میرے والدین نے بڑی خوش دلی سے انھیں معاف کر دیا۔ ہمارے گھر میں یک دم جیسے پہلے والا سکون لوٹ آیا تھا۔

اگلے چند ماہ زندگی خاصی مصروف رہی۔ اظفر والے معاملے سے نمٹنے کے بعد میں دوبارہ اپنی اسٹڈیز میں جت گئی۔ اب میں فائنل ایئر میں تھی اور مجھے بہت محنت کرنی تھی پر یویس کی طرح فائنل میں بھی اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے۔

انھی دنوں میری شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ احتشام کو اسکالرشپ ملا تھا، ایم فل کے لیے اور وہ شادی کر کے جانا چاہتا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد باہر چلا جائے گا اور پھر میں فائنل ایگزامز سے فارغ ہو کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ بعض پلاننگز صرف پلاننگز ہی رہتی ہیں۔ اس وقت میں بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بھی ایسی ہی ایک پلاننگ ہے۔

شادی سے ایک ماہ پہلے تک میں یونیورسٹی جا رہی تھی کیونکہ میں بہت زیادہ چھٹیاں افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

اس دن بھی معمول کے مطابق میں یونیورسٹی سے فارغ ہو کر پوائنٹ پر کھڑی تھی، جب ایک کار میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اس میں سے ایک لڑکے نے میرے قریب آ کر اپنی پشت پر چھپائی گئی ایک سیون ایم ایم نکالی اور بلند آواز میں اردگرد کے لوگوں کو وہاں سے بھاگ جانے کا کہہ کر ہوائی فائرنگ کی۔ چند سیکنڈز میں میرے اردگرد کوئی نہیں تھا۔ میں بالکل گنگ تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پھر اچانک میں نے اپنے ناک اور منہ کے سامنے ایک رومال آتے دیکھا تھا۔ کوئی میرے پیچھے سے آیا تھا۔ چند لمحے سانس روک کے میں نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد کیا ہوا، مجھے یاد نہیں۔

ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک تاریک کمرے میں پایا۔ چند لمحوں تک مجھے یونہی لگا، جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ آخر آل میرے ساتھ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے ساتھ یہ سب ہونے کی تو کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ میرا ذہن اس صورت حال کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ بہت دیر تک میں ماؤف ذہن کے ساتھ سر پکڑے بیڈ پر بیٹھی رہی پھر آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے شروع ہو گئے۔

میں نے سب سے پہلے اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر لان تھا اور اس کے گرد موجود چار دیواری نے مجھے یہ اندازہ

لگانے نہیں دیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے کمرے کے دروازے کو جا کر چیک کیا، وہ حسب توقع بند تھا۔ کمرے میں ایک دوسرا دروازہ باتھ روم کا تھا۔ میرے اعصاب آہستہ آہستہ شل ہو رہے تھے۔ گھڑی شام کے پانچ بجا رہی تھی اور میں جانتی تھی، اس وقت تک میری گمشدگی گھر والوں کے علم میں آ چکی ہوگی اور وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔

رات کے آٹھ بجے کمرے کا دروازہ کھلا اور میں برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آنے والا وہی لڑکا تھا جس نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جسے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر لا کر رکھ دیا۔

''تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔

''میں کون ہوں، یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ کیوں لایا ہوں، یہ بھی میں نہیں جانتا مگر یہاں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ یہاں بے فکر ہو کر رہ سکتی ہیں، بالکل اپنے گھر کی طرح۔ دو تین دن بعد میں آپ کو واپس چھوڑ آؤں گا۔'' اس نے بے حد احترام سے کہا۔

''دو تین دن بعد؟ تم جانتے ہو، میرے خاندان پر کیا گزر رہی ہوگی؟'' میں نے اس کے نرم لہجے سے شہ پا کر کہا۔

''میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، آپ کو چند دن یہیں رہنا ہے۔'' اس بار اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''لیکن آخر کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ تم مجھے کس کے کہنے پر یہاں لائے ہو؟'' میں نے اس بار قدرے تیز آواز میں اس سے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے کمرے سے نکل گیا۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر رونے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے آنسو مجھے وہاں سے نکال نہیں سکتے تھے۔ میں نے اپنے منتشر اوسان اور حواس پر ایک بار پھر سے قابو پانے کی کوشش شروع کر دی۔ میرے اس طرح غائب ہونے سے میرے گھر والوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی، میں اس کا اندازہ لگا سکتی تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی میں اپنے اغوا جیسی حقیقت کو بدل سکتی تھی۔ واحد چیز جو میں کر سکتی تھی، وہ اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو طے کرنا تھا اور وہ میں کر رہی تھی۔

اس رات بیٹھ کر میں صرف یہ جاننے کے لیے سرگرداں رہی کہ مجھے کس کے کہنے پر اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والا کیا چاہتا ہوگا۔ میں نے ہر ممکنہ نام پر غور کیا تھا اور پھر میرا ذہن اظفر کے نام پر ٹھہر گیا تھا۔ حالیہ کچھ عرصے میں وہ واحد شخص تھا جس کے ساتھ میری تلخ کلامی ہوئی مگر یہ میرا ذہن یہ قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ معذرت کرنے کے بعد اس نے ایسا قدم اٹھایا ہوگا مگر اس ایک نام کے سوا کوئی اور شخص نہیں تھا جو میرے ساتھ ایسا کرتا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی، اب میرے ساتھ آگے کیا ہوتا ہے؟

رات گزر گئی۔ اگلے دن میں قدرے زیادہ پرسکون تھی۔ وہی لڑکا صبح نو بجے کے قریب ایک بار پھر ناشتہ لے کر آیا۔

''مجھے صرف ایک بات بتا دو، تم مجھے کب چھوڑو گے؟'' میں نے اس سے کہا۔

''کل۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کل کس وقت؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ مجھے کس نے اغوا کروایا ہے؟''

''نہیں۔''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کس نے اغوا کروایا ہے؟'' اس بار وہ میری بات پر چونک اٹھا۔

''کس نے اغوا کروایا ہے؟'' اس بار اس نے پوچھا۔ اب میں اپنے مہرے آگے بڑھانے کے لیے تیار ہوگئی۔ مجھے زندگی ایک چیس بورڈ پر ایسی جگہ لے آئی تھی جہاں نہ صرف مجھے ہر طرف سے ہونے والی مات سے بچنا تھا بلکہ اس بازی کو اپنے حریف پر الٹنا بھی تھا۔

''اس سے پہلے تم مجھے بتاؤ، کیا تم میرا نام جانتے ہو؟'' میں نے اپنا پہلا مہرہ آگے بڑھایا۔ وہ کچھ ہچکچایا۔

''ہاں۔''

''کیا نام ہے میرا؟''

''فاطمہ نواز۔ اب تم بتاؤ، تمھیں کس نے اغوا کروایا ہے؟'' اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

''میرے کزن نے۔'' وہ چند لمحے کے لیے بالکل ساکت ہوگیا۔ میں اپنا دوسرا مہرہ آگے بڑھا چکی تھی۔

''کون سے کزن نے؟'' اس نے بے حد اضطراب کے عالم میں پوچھا۔

''احتشام نے۔'' میں اپنے مہرے کو بڑے آرام سے پیچھے لے آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''تم جو چاہو سمجھ لو۔'' وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں جو جاننا چاہتی تھی، جان چکی تھی۔ یہ کام اظفر کا تھا، مجھے اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

اس رات میں نے کھانا بھی کھایا اور اگلے دن کے بارے میں اپنا پروگرام بھی طے کیا۔

آپ شاید حیران ہو رہے ہوں کہ میں ایک ایسی لڑکی ہو کر جسے اغوا کر لیا گیا ہو، اس طرح غیر جذباتی ہو کر بات کیسے کر رہی ہے۔ آپ کی حیرانی بجا ہے میری جگہ کوئی کمزور اعصاب کی لڑکی ہوتی تو وہ یقیناً اب تک رو رو کر ہلکان ہو چکی ہوتی۔ اپنے مستقبل کا سوچ سوچ کر وہ خوف سے کانپ رہی ہوتی ہے۔ اپنے گھر والوں کا تصور کر کے اس کا دماغ شل ہو گیا ہوتا مگر کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کر کے کیا حاصل ہوتا؟ جو کچھ ہو چکا تھا، میں اسے بدل نہیں سکتی تھی اور یہ سب میری کسی غلطی کی وجہ سے بھی نہیں ہوا تھا۔ آنسو کمزور آدمی بہاتا ہے یا وہ جسے پچھتاوا ہو۔ میرے ساتھ یہ دونوں ہی چیزیں نہیں تھیں۔ میں ایک ایسے مالک مکان کی طرح تھی جس کا مکان تباہ کر دیا گیا ہو مگر میں نے ملبے پر ماتم اور واویلا کرنے کے بجائے اس میں سے ان چیزوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا جو صحیح سلامت تھیں۔

اگلے دن وہ لڑکا ایک بار پھر صبح ناشتہ لے کر آیا۔

''مجھے آپ سے صرف ایک درخواست کرنی ہے کہ واپس چھوڑتے ہوئے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائیں مگر مجھے بے ہوش نہ کریں۔'' میں نے اس سے کہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

دوپہر کے وقت وہ دوبارہ آیا اور یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی تھی۔ اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد پہلے کی طرح مجھے ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ بہت دیر گاڑی چلتی رہی پھر رک گئی۔ مجھے گاڑی سے اتار دیا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ میں ایک ویران سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور وہی گاڑی دور جا رہی تھی۔ نمبر نوٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ایسی وارداتوں میں زیادہ تر چوری کی گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور ایسا نہ ہو تو بھی نمبر پلیٹ ضرور جعلی ہوتی ہے۔

بعض دفعہ آزادی پانے کے بعد آپ خود کو اور زیادہ قید میں محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔ دو دن تک گھر سے غائب رہنے کے بعد...... میں نے اپنی آنکھوں کو گیلا محسوس کیا پھر میں نے اپنے دماغ سے ان سوچوں کو دوبارہ جھٹک دیا۔ میں جانتی تھی، اب مجھے آگے کیا کرنا تھا۔

کافی دور تک چلنے کے بعد مجھے ایک پی سی او نظر آیا۔ میرا بیگ میرے پاس ہی تھا اور اس میں کچھ روپے تھے مگر پی سی او میں جاتے جاتے میں ٹھٹک گئی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔ میں سڑک پر دوبارہ چلنے لگی۔ کافی دور جا کر مجھے ایک ٹیکسی ملی۔ میں نے ٹیکسی کو پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں کسی نہ کسی طرح ڈی ایس پی کے آفس بھی پہنچ گئی۔ میں نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والا پورا واقعہ انھیں سنایا۔ اس کے بعد میں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ میں نے اپنے رویے سے شاید انھیں حیران کر دیا تھا اس لیے وہ فوراً میری مدد کو تیار ہو گئے۔ میں نے ان کے آفس سے اظفر کو فون کیا، فون ملازم نے اٹھایا۔ میں نے اسے اپنا اصل نام بتانے کے بجائے ایک فرضی نام بتایا اور اظفر سے بات کرانے کے لیے کہا۔ میں جانتی تھی، اظفر یقیناً اس وقت گھر ہو گا تاکہ یہ جان سکے کہ کیا ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔ ان لوگوں نے مجھے چھوڑنے کے بعد اظفر کو اطلاع ضرور دی ہو گی۔

اظفر فون پر میری آواز سن کر شاکڈ رہ گیا۔

''فاطمہ، تم کہاں سے بات کر رہی ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایکٹنگ شروع کر دی۔ میں نے روتے ہوئے اسے فون پر بتایا کہ مجھے احتشام نے اغوا کروایا تھا اور جن لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا، انھوں نے میرے ساتھ بہت بدتمیزی اور بے ہودگی کی ہے۔ بہت دیر تک دوسری طرف اظفر کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ یقیناً یہ سن کر سکتے میں آ گیا ہو گا۔

''میں تمھارے گھر آ رہی ہوں۔ میں احتشام کو شوٹ کرنا چاہتی ہوں اور مجھے ایک پسٹل کی ضرورت ہے اور وہ مجھے تم ہی دے سکتے ہو۔''

اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے فون بند کر دیا۔

اس کے بعد پہلے سے طے شدہ انتظامات کے تحت اظفر کے فون پر چیک رکھا گیا اور میرے فون کے بعد چند منٹ کے اندر اظفر نے جس نمبر پر کال کی، اسے نہ صرف ٹریس آؤٹ کر لیا گیا بلکہ اظفر کی کال بھی ریکارڈ کر لی گئی۔ اس نے اسی لڑکے کو کال کی تھی اور وہ اسے گالیاں دے رہا تھا،

جبکہ وہ لڑکا قسمیں کھا رہا تھا کہ اس نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ اس نمبر کو ٹریس کرنے کے اگلے دس منٹ کے اندر اس جگہ کا ایڈریس بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔ میں اپنے مہرے بڑی تیزی سے آگے بڑھا رہی تھی۔

اس کے بعد میں اظفر کے گھر پہنچ گئی۔ میں نے اسے گیٹ پر پایا اور وہ بے حد پریشان تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے اپنے گھر سے دور لے آیا اور پھر انتہائی پریشانی کے عالم میں اس نے مجھ سے اس بدتمیزی کی تفصیل پوچھی۔

''انھوں نے میرے ساتھ بہت بے ہودہ باتیں کیں، وہ مجھے چھیڑتے رہے۔''

''بس؟''

''تمہارا خیال ہے، یہ کچھ نہیں ہے؟'' میں اس پر بگڑنے لگی۔ اس کے چہرے پر یک دم اطمینان ابھر آیا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔

''احتشام کو شوٹ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس نے تمھیں اغوا نہ کروایا ہو، تمھیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہو۔'' اس نے مجھ سے اس وقت کہا، جب میں نے اسے ایک پسٹل مہیا کرنے کے لیے کہا۔

''احتشام کی حمایت مت کرو۔ میں جانتی ہوں، یہ سب اس نے کروایا ہے۔ میں اس وقت تک اب اپنے گھر نہیں جاؤں گی، جب تک اسے جان سے مار نہیں دیتی۔'' میں چلائی۔

وہ مجھے سمجھانے لگا کہ اس وقت میرا گھر جانا کتنا ضروری ہے اور سب لوگ کس طرح میرے لیے پریشان ہیں۔ میں تھوڑی بحث کے بعد مان گئی۔

پھر وہ مجھے گھر لے آیا۔ پندرہ سال بعد بھی مجھے آج تک گھر پہنچنے پر اپنے گھر والوں کے تاثرات نہیں بھولے۔ سب لوگ مجھے دیکھ کر جیسے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ دو دنوں میں، میں انسان سے بھوت بن گئی تھی۔ اظفر نے میرے ملنے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا، سوائے اس کے کہ میں احتشام پر اپنا شبہ ظاہر کر رہی ہوں مگر کسی کو بھی یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کسی وجہ کے بغیر اغوا کیا گیا تھا اور کوئی نقصان پہنچائے بغیر رہا کر دیا گیا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی تھی اور پھر میں اس وقت تک خاموش رہی، جب تک سب لوگ اپنے گھروں کو چلے نہیں گئے۔ رات کو میں نے اپنے ابو کو کمرے میں اکیلے بلوایا اور انھیں سب کچھ بتا دیا۔

''کل آپ اپنے سب بھائیوں کو بلوائیے اور ان کے سامنے میری شادی احتشام سے کرنے کا فیصلہ سنائیے۔''

میں نے انھیں اپنے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

اگلے دن ایک بار پھر سب اکٹھے تھے اور میری زندگی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا، جب میں اچانک ان کے درمیان چلی گئی اور میں نے احتشام سے شادی سے انکار کر دیا۔

پورے خاندان کے لیے یہ ایک شاک تھا اور میں نے سب سے زیادہ حیرت زدہ احتشام کو دیکھا۔ شاید اسے خواب میں بھی یہ توقع نہیں تھی

کہ میں اس طرح شادی سے انکار کردوں گی اور وہ بھی اس واقعے کے بعد۔ اسی کی طرح سارے خاندان والے بھی حیران تھے کہ میں نے اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اس بات پر شکرادا کرنے کے بجائے کہ احتشام ابھی بھی مجھ سے شادی پر تیار تھا، اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ بس ایک شخص تھا جس کے چہرے پر اطمینان تھا، کیوں اطمینان تھا، اس کا خیال تھا کہ یہ بات صرف وہ جانتا ہے اور یہی اس کی خوش فہمی تھی۔ آپ کو یقیناً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے نا کہ وہ شخص اظفر تھا۔

''مجھے احتشام سے شادی نہیں کرنی۔'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''آپ لوگوں نے ایک غلط شخص کے ساتھ میری نسبت طے کردی تھی۔ میں اس شخص کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکتی۔'' میں کہتی گئی۔

''کیوں احتشام کے ساتھ شادی کیوں نہیں کرنی......؟ اب تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تم اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں، پہلے تم نے کیوں کوئی اعتراض نہیں کیا؟''

''پہلے میں بے وقوف تھی۔ مجھے حقیقت کا پتا نہیں تھا، اب میں سب کچھ جان چکی ہوں۔'' احتشام بے یقینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے مجھ سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔

''کیا جان چکی ہو تم؟'' ابو نے کہا۔

''یہ بتانا ضروری نہیں ہے، بس میں احتشام سے شادی نہیں کروں گی۔''

''احتشام سے شادی نہیں کرو گی تو کس سے شادی کرو گی؟'' ابو چلائے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ میں نے اظفر کی طرف دیکھا، وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے کہا۔

''اظفر سے۔'' اظفر کو یقیناً اس وقت 440 وولٹ کا کرنٹ لگا ہوگا۔ وہ اپنی کرسی سے دو فٹ اونچا اچھلا تھا۔ اس کے چہرے کا اطمینان، رخصت ہو چکا تھا۔ ''ہاں، میں اظفر سے شادی کروں گی۔ صرف وہی ہے جو مجھے سمجھ سکتا ہے جو میرے ساتھ مخلص ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ آپ سب لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ آپ کے دلوں میں میرے لیے شک ہے۔ صرف وہ ہے جو میرے لیے ہمدردی رکھتا ہے۔'' میں نے زاروقطار آنسو بہاتے ہوئے کہا پھر میں نے اظفر کی طرف دیکھا جو منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''اظفر، تم مجھ سے شادی کرو گے نا؟ تم تو مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں جانتی ہوں، تم دوسروں سے مختلف ہو۔ تم احتشام نہیں ہو۔''

میں نے چند لمحوں تک اسے چپ چاپ خود کو دیکھتے پایا اور پھر اس کی گردن اثبات میں ہل گئی اور تبھی تائی امی یک دم چلاتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ تایا بھی غضب ناک انداز میں دہاڑنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو یہ نکاح اسی وقت ہوگا۔ کیوں اظفر اسی وقت نکاح کرو گے؟'' میں نہیں جانتی، میرے، ابو نے کس حوصلے سے اظفر کو پکارا ہوگا، جبکہ ان کا دل چاہ رہا ہوگا کہ وہ اس کو قتل کر دیں۔ اظفر نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔

''میرے بھائی کو نکاح خواں کو لینے بھیج دیا گیا اور ابو تایا کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گئے۔ ان سے پہلے احتشام اٹھ کر وہاں

سے جا چکا تھا۔ تائی امی مجھے گالیاں دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ وہ اظفر سے میری شادی کبھی نہیں ہونے دیں گی اور اظفر۔ اظفر بالکل چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا اور میں...... میں کیا کر رہی تھی؟ میں چیس بورڈ پر اپنے اگلے مہرے کی جگہ طے کر رہی تھی۔

دس منٹ بعد ابو کمرے میں تایا کے ساتھ داخل ہوئے۔ تایا کی دہاڑ ایک عجیب سی خاموشی میں بدل چکی تھی۔ تائی نے انھیں دیکھ کر واویلا شروع کر دیا مگر انھوں نے تائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر اظفر یہی چاہتا ہے تو پھر مجبوری ہے، ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔'' ان کی بات پر تائی یقیناً بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیں۔ انھوں نے اپنا واویلا جاری رکھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نکاح نامے پر دس لاکھ مہر سکہ رائج الوقت کے عوض اظفر کو اپنا شوہر تسلیم کرتے ہوئے دستخط کر رہی تھی۔ دس لاکھ حق مہر پر وہ لوگ کیسے مانے۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تائی امی ناراض ہو کر میرے نکاح سے پہلے ہی گھر جا چکی تھیں۔ دوپہر بارہ بجے میں فاطمہ نواز سے فاطمہ اظفر بن کر اظفر کے گھر آ چکی تھی۔

آپ سب لوگ یقیناً اس وقت شاک کے عالم میں بیٹھے ہوں گے۔ آپ میں سے کچھ میری حماقت پر افسوس کر رہے ہوں گے اور کچھ میری بے وقوفی پر ملامت۔ جو باقی ہوں گے، وہ شاید مجھ پر طیش کھا رہے ہوں۔ بہرحال میں نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اس طرح کیوں کیا۔ احتشام سے شادی سے انکار کیوں کیا؟ اظفر سے شادی کیوں کی؟ اتنا فوری اور اچانک نکاح کیوں کیا؟ پھر فوراً ہی رخصتی کیوں کروالی؟ دس لاکھ کا مہر کیوں طے کروایا؟

''کیا میں پاگل ہو چکی تھی یا میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ حیرت ہوگی، شاید آپ کو یہ جان کر کہ اس وقت میرے حواس کسی بھی لڑکی سے زیادہ تیزی اور بہتر طریقے سے کام کر رہے تھے۔ میں نے ہر چیز سوچ سمجھ کر کی تھی۔ ہر قدم پوری احتیاط سے اٹھایا تھا۔ اپنے ہر مہرے کو آگے بڑھانے سے پہلے میں نے کم از کم دس بار سوچا تھا اور یقیناً کسی چیز پر دس بار سوچنے کے بعد وہ بھی ٹھنڈے دماغ سے آپ پھر غلطی تو نہیں کر سکتے مگر شاید آپ لوگ اس وقت تک ان تمام باتوں کو جان نہیں پائیں گے، جب تک میں آپ کو ان سوالوں کے جواب نہیں دوں گی تو چلیں شروع کرتی ہوں۔

احتشام سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ میں جن حالات سے گزری تھی، اس کے بعد اگر احتشام سے میری شادی ہو بھی جاتی تب بھی ہم دونوں اچھی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ مرد کے دل میں اگر ایک بار شک کا کانٹا گڑ جائے تو پھر ساری عمر وہ کانٹا گڑا ہی رہتا ہے۔ کسی طرح اسے نکال بھی دیا جائے، تب بھی یہ کانٹا اپنے پیچھے ایسا زخم چھوڑ جاتا ہے جس سے اٹھنے والی ٹیسیں نہ صرف خود اسے ساری عمر کے لیے بے حال رکھتی ہیں بلکہ عورت کو بھی لاچار کر دیتی ہیں۔

احتشام کچھ عرصہ شاید کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ گزار لیتا مگر وہ اپنی زندگی میرے ساتھ نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ آئیڈیلسٹ تھا۔ مجھے پسند کرنے کے باوجود وہ میرے ساتھ کبھی پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ اسکالرشپ پر باہر جا رہا تھا اور اس کے آگے ترقی کی ایسی راہیں کھلی ہوئی تھیں جن پر وہ میرے جیسی لڑکی کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ اظفر کے ساتھ میں ایک اچھی اور پرسکون زندگی گزار سکتی تھی۔ بس مجھے کچھ چیزوں کو بھلانا پڑتا اور میں وہ کرنے پر تیار تھی۔ اظفر ساری عمر اسی احساس برتری میں رہتا کہ اس نے مجھے ایک مشکل وقت میں سہارا دیا، جبکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ

مشکل وقت بھی اسی کا لایا ہوا تھا اس لیے کم از کم اس کے دل میں شک نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاں تک محبت کی بات ہے تو وہ مجھ سے تھوڑی بہت محبت ضرور کرتا تھا اور یہ محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے وہ بڑی آسانی سے مجھے قبول کر سکتا تھا۔

آپ ہنس رہے ہیں نا، یہ سوچ کر میں بھی بس ایک عورت ہی نکلی۔ مجبور، بے بس، آخر میں محبت کی ''ہڈی'' پر سمجھوتا کر لینے والی اور حالات سے کمپرومائز پر مجبور۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں اظفر سے صرف اس لیے شادی پر تیار ہو گئی کہ اس اغوا کے بعد وہ میرے لئے احتشام سے زیادہ اچھا اور بہتر ثابت ہو سکتا تھا اور کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ میں نے سب کچھ بھلا دیا تھا یا بھلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو آپ واقعی عورت کو نہیں جانتے۔

کوئی مرد اگر ایک ایسی عورت سے شادی کرے جو اغوا شدہ ہو تو کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی معاشرے میں کتنی بے عزتی ہوتی ہو گی۔ اپنے دوستوں کے سامنے اسے کتنی وضاحتیں پیش کرنی پڑتی ہوں گی۔ پیٹھ پیچھے ہونے والی باتوں سے وہ کتنا خوف زدہ ہوتا ہو گا۔ میں نے اپنے چہرے پر مل جانے والی کالک کا آدھا حصہ اظفر کے چہرے پر بھی لگا دیا تھا اور اسے اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری اور احتشام کی بے عزتی ہو۔ اس کا خیال ہو گا کہ مجھ سے شادی کی صورت میں احتشام کبھی خاندان میں سر اونچا کر کے نہیں چل سکے گا اور شاید وہ مجھے بھی اذیت پہنچانا چاہتا تھا مگر میں نے یہ ذلت ایک خوبصورت ہار کی شکل میں اس کی گردن میں ڈال دی تھی۔

اظفر سے فوری نکاح کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ واپس گھر چلا جاتا تو یقیناً تائی کسی نہ کسی طرح اس کا ذہن تبدیل کر دیتیں یا ہو سکتا ہے، وہ خود ہی یہ ساری باتیں سوچنے لگتا۔ میرے آنسوؤں نے اسے جذباتی کیا تھا اور میں انہی جذبات کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ فوری رخصتی کی وجہ بھی یہی تھی۔

دس لاکھ کا حق مہر اظفر نے خود لکھ کر دیا تھا۔ جب میرے ابو نے اس سے کہا تو اس نے قطعاً کوئی چوں چرا نہیں کی۔ شاید وہ اعتراض کرتا اگر تایا ابو اعتراض کرتے مگر وہ بالکل خاموش تھے، وہ کیوں خاموش تھے۔ اب کیا یہ بات بھی آپ کو بتانی پڑے گی کہ ابو جب دس منٹ کے لیے انھیں کمرے سے باہر لے کر گئے تھے تو انھوں نے کیا کیا تھا۔ انھوں نے اس ڈی ایس پی سے ان کی بات کروائی تھی۔ جس نے اظفر کا پورا کارنامہ فون پر ان کے گوش گزار کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اظفر کی ریکارڈڈ آواز بھی سنائی اور اس جرم کے سلسلے میں جو دفعہ اظفر پر عائد ہوتی تھی اور اس کے نتیجے میں جو سزا اسے مل سکتی تھی، اس سے بھی مطلع کیا۔ تایا یہ سب کچھ جان کر سکتے میں آ گئے تھے۔ مگر یہ سکتہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہا۔ ان کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ انھوں نے ابو سے درخواست کی کہ وہ اظفر کی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہیں مگر وہ اس بات کو چھپائے رکھیں ورنہ تایا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ابو نے بخوشی یہ بات مان لی اور ساتھ ہی تایا سے اس بات کا حلف لیا کہ وہ بھی اظفر سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کریں گے کہ ان کو اس کے کارنامے کا پتا ہے۔

اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میرے ابو یہ کیوں چاہتے تھے کہ وہ اس سلسلے میں اظفر سے بات نہ کریں، صرف اس لیے کہ اگر اظفر کو یہ پتا چل جاتا کہ اس کا راز افشا ہو چکا ہے اور میں نے اسے بے وقوف بنا کر شادی کی ہے تو پھر یقیناً ہم دونوں کے تعلقات پر اثر پڑتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں نا کہ مرد کو اگر یہ احساس ہو جائے کہ عورت نے اسے بے وقوف بنا دیا ہے تو پھر وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہو جاتا ہے۔ کبھی بھی کسی

کو بھی ڈس سکتا ہے، خاص طور پر اس عورت کو جس سے اس نے چوٹ کھائی ہو۔ اظفر کے ساتھ بھی یہی ہوتا۔ تایا اس کے ساتھ بات کرتے اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے جان چھڑا لیتا۔ آپ اندازہ کر ہی سکتے ہیں کہ شادی کے کچھ عرصے بعد طلاق کی صورت میں، میں اگر اظفر کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا چاہتی تو اس کی کیا حیثیت رہ جاتی۔ ایک عورت شادی سے پہلے کیے گئے اغوا کے سلسلے میں اپنے ہی شوہر پر مقدمہ کرتی تو عدالت کی کس حد تک حمایت حاصل کر سکتی تھی۔ عدالت تو سب سے پہلے یہ پوچھتی کہ اگر اس نے مجھے اغوا کیا تھا تو پھر میں نے اس سے شادی کیوں کی اور تب یقیناً یہ سب دلائل جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں، بوگس قرار دے دیے جاتے...... تو اظفر سے سب کچھ چھپانے کی یہی وجہ تھی۔

آپ میں سے بہت سے احتشام کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہے ہوں گے اور اس الجھن میں گرفتار ہوں گے کہ میں نے اظفر کے سامنے اس اغوا کا الزام احتشام کے سر کیوں ڈالا۔ یہ ضروری تھا، اظفر، احتشام کو ناپسند کرتا تھا اور میرے اس الزام نے اس کی انا کی خاصی تسکین کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں احتشام سے مکمل طور پر بدگمان ہو گئی ہوں اور اسے اس بات کا یقین دلانا اس لیے ضروری تھا کیونکہ رہائی پاتے ہی میں طے کر چکی تھی کہ اب مجھے احتشام سے نہیں بلکہ اظفر سے شادی کرنا ہے اور پھر ظاہر ہے، مجھے احتشام کے بارے میں اظفر سے کچھ نہ کچھ تو ایسا کہنا تھا جس سے اسے یہ یقین ہو جاتا کہ میں اب احتشام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا مطلب ہے، اپنے اغوا کنندہ کے بارے میں۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہوا ہوگا؟ اظفر مجھ سے شادی پر بہت خوش تھا۔ میں نے اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ میں اس کی بہت زیادہ احسان مند ہوں کیونکہ اس نے زندگی کے ایسے لمحات میں میری مدد کی تھی، جب کوئی عام مرد میری مدد کبھی نہ کرتا۔ میں یہ ساری باتیں دن میں کئی کئی بار اس سے کہتی۔ اتنی بار کہ شاید وہ تنگ آ جاتا ہوگا اور پھر جب وہ مجھے کہتا کہ میں سب کچھ بھول جاؤں تو میں اس سے کہتی۔

''نہیں اظفر، ہر بات بھلانے والی نہیں ہوتی۔ کم از کم وہ سب کچھ تو ہرگز نہیں جو تم نے میرے ساتھ کیا۔'' اس کا چہرہ اس وقت یوں روشن ہو جاتا، جیسے کسی نے اس پر 1000 ووٹ کا بلب لگا دیا ہو اور میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچتی ''اور جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا ہے، وہ تمہیں کتنا مہنگا پڑے گا۔ کاش اس کا تم کبھی اندازہ کر سکتے۔'' میری باتوں نے بیٹھے بٹھائے اسے راجہ اندر بنا دیا تھا اور میں چاہتی تھی، وہ خود کو راجہ اندر سمجھتا رہے، کم از کم اس وقت تک، جب تک وہ اپنا تخت و تاج میرے نام نہیں کر دیتا۔

تائی اماں نے میرے آنے پر خاصا ہنگامہ کھڑا کیا تھا مگر میں نے ان کے سامنے ایک فرمانبردار اور تابعدار بہو کا رول انتہائی مہارت سے ادا کیا۔ وہ مجھ سے جتنا خار کھاتیں، میں ان کی اتنی خاطریں کرتی۔ خاص طور پر تب جب اظفر اور تایا گھر پر ہوتے۔ شاید اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو ''ستی'' سے کم کا درجہ نہ دیتا اور تایا اور اظفر نے مجھے یہی درجہ دے دیا تھا مگر میں ''ستی'' نہیں تھی اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی شوق تھا۔ تائی میرے بارے میں جو بے ہودہ بات کہتیں، میں اس کے ساتھ دس اس سے زیادہ بے ہودہ باتیں شامل کرتی اور اظفر کے سامنے روتے ہوئے سارے دن کی روداد سنا دیتی۔

''امی نے آج مجھ سے کہا کہ میں نے یونیورسٹی میں جن لڑکوں کے ساتھ دوستی کی تھی، انہی لڑکوں کے ساتھ عیاشی کرنے میں گھر سے چلی گئی تھی۔'' میں اندرونی اطمینان اور بیرونی اضطراب کے ساتھ موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ اظفر کو بتاتی۔ اس کا پارا ہائی ہو جاتا۔

''تم امی کی باتوں پر دھیان مت دیا کرو۔ انھیں فضول باتیں کرنے کی عادت ہے۔'' وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ میں اس کوشش کے

جواب میں ایک اور من گھڑت بات سنا دیتی، وہ اپنا غصہ پیتے ہوئے ایک بار پھر میرے آنسو خشک کرنے کی سعی کرتا۔ میں ردِعمل کے طور پر اسے ان چند اور خوبصورت اقوال سے نواز دیتی جو میں تائی سے منسوب کرتی مگر وہ میری اپنی ذہنی اختراع ہوتے پھر یہ سلسلہ دراز ہو جاتا اور اس کا اختتام کچھ اس طرح ہوتا کہ میں اطمینان سے بیڈ پر لیٹ کر چادر سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر لمبی تان کر سو جاتی، جبکہ اظفر کمرے کے چکر لگاتے ہوئے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا۔

اگلے دن صبح ناشتے کی میز پر وہ تائی اماں سے بات کرتا، نہ ہی ان کے ہاتھ سے کوئی چیز لیتا اور بھرپور کوشش کرتا کہ ہر ضرورت کی چیز مجھ سے لے۔ اس کے جانے کے بعد تائی سارا دن پریشان پھرتی رہتیں اور میں اطمینان سے اپنے کمرے میں رہتی۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ میری بتائی ہوئی کسی جھوٹی بات پر اظفر تائی سے بات کرنے پہنچ جاتا اور جب تائی اماں یہ کہتیں کہ انھوں نے یہ بات کہی ہی نہیں اور پھر جھڑک کر مجھ سے پوچھتیں تو میں بے بسی سے اظفر کو دیکھتے ہوئے کہہ دیتی کہ ہاں، انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اظفر سوچتا، میں تائی سے خوف زدہ ہوں اس لیے کچھ نہیں بتا رہی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ کچھ اور بھڑک جاتا پھر اس کے اور تائی کے درمیان خاصا جھگڑا ہوتا جس میں تائی میرے بارے میں اپنے دلی جذبات اور خیالات کا خاصے اونچے انداز میں اظہار کرتیں اور اظفر کو یقین ہو جاتا کہ جو کچھ میں وقتاً فوقتاً اسے بتاتی رہتی تھی، وہ بالکل درست تھا جبکہ تائی یہی سمجھتیں کہ میں ان کے بیٹے کو ان کے خلاف بھڑکا رہی ہوں۔ (وہ بالکل ٹھیک سمجھتی تھیں، میں ایسا ہی کر رہی تھی)

میں نے اس سلسلے کو صرف تائی امی تک محدود نہیں رکھا بلکہ میں نے اظفر کی بہنوں سے منسوب کردہ باتیں بھی اس کے گوش گزار کرنے کا فریضہ لگن اور دل جمعی سے ادا کیا۔ نتیجہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اظفر صرف چار ماہ میں اپنی تینوں بہنوں سے اتنا متنفر ہو گیا کہ وہ ان کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا اگر وہ گھر میں آتیں تو ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے سیدھا کمرے میں آ جاتا اور پھر تب تک وہیں رہتا، جب تک وہ چلی نہ جاتیں اور میں...... میں اس وقت اپنی نندوں کی خاطر مدارت کر رہی ہوتی جس پر اظفر چڑ تا تھا۔ (جبکہ میری نندیں اسے میرا فریب سمجھتی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی سمجھتی تھیں، یہ فریب ہی تھا)

''تم ان کی ملازمہ نہیں ہو کہ اس طرح ان کی خدمتیں کرتی پھرتی ہو۔'' اظفر مجھ سے کہتا اور میں جواب میں کہتی۔

''وہ تمہاری بہنیں ہیں اظفر۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں مگر میں انھیں اس لیے چھوڑ نہیں سکتی کیونکہ ان کا رشتہ تم سے ہے اور تم سے منسوب ہر چیز سے مجھے محبت ہے۔'' میری بات پر وہ کتنی ہی دیر مجھے دیکھتا رہتا۔

شادی کے صرف چھ ماہ کے اندر اندر میں نے اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ لفظی قبضہ نہیں ہے، میں نے واقعی اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے وہ گھر اپنے نام کروا لیا تھا۔ آپ کو جھٹکا لگا ہے نا، اس کہانی میں آپ کو ایسے ہی جھٹکے لگ رہے ہوں گے اور آگے چل کر بھی لگیں گے۔ بہر حال میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں نے وہ گھر اپنے نام کروا لیا تھا اور یہ میں نے کیسے کیا تھا چلیں اس کا احوال بھی سن لیں۔

تایا کا گھر اظفر کے نام تھا، جب تایا حویلی سے وہاں منتقل ہوئے تھے تو انھوں نے وہ گھر اظفر کے نام کر دیا تھا۔ کیونکہ اظفر ان کی اکلوتی دیرینہ اولاد تھی۔ یہ بات میں جانتی تھی اور چیس بورڈ پر اگلی چال میں نے گھر کے لیے چلی تھی۔ جب میں نے اظفر کو اچھی طرح سے اس کی ماں اور

بہنوں سے متنفر کر دیا تو ایک شام تائی کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کے بعد جب اظفر اپنے کمرے میں آیا تو حسب معمول جھنجلایا ہوا تھا۔ میں حسب معمول خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے حسب معمول مجھے خاموش کروانے کی کوشش کی۔ میں نے حسب معمول اپنے آنسوؤں کی مقدار اور رفتار میں اضافہ کر دیا۔ وہ حسب معمول مجھے بہلانے لگا اور حسب معمول بہلنے کے بجائے میں اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ وہاں جا کر میں کھڑکی سے باہر لان میں جھانکنے لگی۔ وہ میرے پاس آ گیا۔

''امی غلط نہیں کر رہی ہیں، جو عورت گھر کی مالک ہو، اسے حق ہوتا ہے کہ وہ اس گھر میں رہنے والوں کے ساتھ جیسا چاہے کرے۔'' میں نے اپنی آواز کو حسب مقدور غمگین بناتے ہوئے کہا۔

''یہ گھر امی کا نہیں، میرا ہے اور میری بیوی ہونے کے حوالے سے تم اس کی مالک ہو۔'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

''نہیں اظفر اس طرح کوئی بھی مالک نہیں ہوتا۔'' میں نے ایک لمبا وقفہ دیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''جب میری منگنی ہوئی تھی تو احتشام نے ان دنوں میری امی سے کہا تھا کہ وہ باہر سے پڑھ کر واپس آنے کے بعد اپنا گھر بنائے گا جسے وہ میرے نام کر دے گا۔ جب امی نے مجھے یہ بات بتائی تو میں نے مذاق میں بات اڑا دی مگر بعد میں جب میں نے سوچا کہ ایک الگ اور اپنا گھر کتنی خوشی اور سکون کا باعث ہوتا ہے تو مجھے احتشام پر بہت......'' میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''میرے ساتھ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا اور احتشام میرے ساتھ یہ سب نہ کرتا تو شاید آج میرا بھی اپنا ایک گھر ہوتا۔ اس گھر سے بھی بڑا پھر کوئی اس طرح میری تذلیل نہیں کر سکتا تھا۔'' میں تیزی سے کہہ کر اپنے بیڈ کی طرف آ گئی تھی۔ شادی کے بعد میں نے پہلی بار احتشام کا اس طرح ذکر کیا تھا ورنہ میں ہمیشہ اسے برے لفظوں میں ہی یاد کرتی تھی اور میں جانتی تھی، اب اظفر کے اندر جوار بھاٹے اٹھ رہے ہوں گے۔ میں اطمینان سے بیڈ پر آ کر سو گئی۔

رات کے تین بجے کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ میں کچھ گھبرا کر اٹھی تھی۔ ''فاطمہ، میں صبح یہ گھر تمھارے نام کر رہا ہوں۔'' مجھے یہ جملہ صبح سننے کی توقع تھی، وہ رات کے اس پہر سنا رہا تھا۔ اب وہ میری طرف اس بچے کی طرح دیکھ رہا تھا جو کوئی اچھا کام کر کے داد کا منتظر ہو اور میں نے وہ داد اسے دینی شروع کر دی۔

''نہیں اظفر، آخر تم میرے لیے کیا کیا کرو گے؟''

''جو کر سکتا ہوں، وہ کروں گا۔ مجھے صرف یہ بتاؤ، تم میرے ساتھ خوش ہو نا؟''

''تمہارا ساتھ میرے لیے جس احساس کا باعث ہے، وہ خوشی سے بہت بڑا ہے مگر یہ گھر میں نہیں لوں گی۔ میں تمہاری چیز لینا نہیں چاہتی۔''

''جب میں خود تمہارا ہوں تو میری ہر چیز بھی تمہاری ہو جاتی ہے۔'' اس نے کہا تھا اور اس کے بعد اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کہی تھیں۔

خیر تو گھر میرا ہو گیا۔ اس کے بعد کیا تھا؟

اس کے بعد آہستہ آہستہ میں نے ہر ایک چیز کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا۔ تائی اماں نے گھر میرے نام کرنے پر واویلا کیا تھا مگر اظفر کے سامنے وہ کیا کر سکتی تھیں اور پھر تایا ابا تھے جو میری طرف داری کیا کرتے تھے۔ میرے لیے سب کچھ آسان سے آسان تر ہو گیا۔ اگلے کچھ سالوں

میں، میں نے اظفر کو اس کے دوستوں سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا۔ میرے بچوں کی پیدائش نے اس کام میں اور بھی آسانی کر دی۔ میں نے اظفر کو بچوں کی ذمے داریوں اور کاموں میں پوری طرح الجھا دیا۔ اس کا فارغ وقت بچوں کو سیر وتفریح کروانے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں صرف ہوتا تھا۔ میں چاہتی ہی نہیں تھی، وہ گھر سے باہر کہیں اور کچھ وقت گزارے، کہیں اور آئے جائے۔

تینوں بچوں کی پیدائش پر میں اظفر سے فیکٹری کے کچھ شیئرز ان کے نام لگواتی رہی اور اب حال یہ ہے کہ گھر میرے نام ہے۔ فیکٹری میرے بچوں کے نام ہے۔ یہی حال اس کے بنک اکاؤنٹس اور باقی جائیداد کا ہے۔

پندرہ سال بعد آج میں اس پوزیشن میں ہوں کہ چاہوں تو اظفر کو اس کے اپنے گھر اور بزنس سے بے دخل کر دوں، اسے اس کے بچوں سے ملنے نہ دوں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اظفر نے مجھے یہ قانونی اختیار دے رکھا ہے کہ اگر کبھی ہماری علیحدگی ہوگئی تو بچے میرے پاس رہیں گے اور وہ ان کی تحویل کا مطالبہ نہیں کرے گا۔

پندرہ سال پہلے میں نے چیس بورڈ پر بنے ہوئے مہروں کے ساتھ ایک ایسی بازی شروع کی تھی جس میں ہر خانے پر ایک بڑی مات میری منتظر تھی اور مجھے دیکھنا تھا کہ پٹے ہوئے مہروں کے ساتھ میں اس مات سے کیسے بچتی ہوں۔ آج پندرہ سال بعد میں اظفر اعزاز کو اپنی جگہ لے آئی ہوں۔ مجھ میں اور اس میں فرق بس یہ ہے کہ مجھے پتا تھا کہ میرے چاروں طرف مات ہے اور اظفر یہ نہیں جانتا۔

مگر میں اظفر کو چیک میٹ کبھی نہیں دوں گی۔ پھانسی پر کسی کو لٹکانے سے بہتر ہے کہ آپ اس بندے کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیں اور تختے کا لیور اپنے ہاتھوں میں رکھیں پھر اطمینان سے زندگی گزارتے رہیں۔ آپ خود سوچیں اگر زندگی میں اب کبھی اظفر کو یہ پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کتنے بڑے فریب میں گزاری ہے تو وہ کیا کرے گا۔ اپنے گناہ سے انکار کیسے کرے گا۔ پولیس سٹیشن میں ریکارڈ شدہ ٹیپ اب بھی میرے پاس ہے۔ اگر آج میں وہ ٹیپ اسے سنا دوں تو پھر وہ مجھ سے اور اپنے بچوں سے نظر کیسے ملائے گا اور پھر اگر میں اس کی مکمل تباہی کی خواہش کروں تو میں اسے سڑک پر لا سکتی ہوں۔ وہ صرف مالی طور پر بھی تباہ نہیں ہوگا ذہنی اور جذباتی طور پر بھی تباہ ہو جائے گا مگر میں نے آپ سے کہا نا کہ ایسا کر کے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے ایک شوہر کی اور میرے بچوں کو ایک باپ کی ضرورت ہے اور اس لیے میں اظفر کو استعمال کر رہی ہوں، جھوٹے لفظوں کے فریب دے کر۔ کیا برا ہے اگر بندہ سال میں چار، چھ بار کسی کے سامنے جھوٹی تعریفوں کے پل باندھ دے۔ ایسے پل جن پر لوگوں کو چڑھانے کے بعد آپ جب چاہیں لوگوں کے پیروں تلے سے زمین کھینچ سکیں۔ میں بھی اظفر کے ساتھ یہی کرتی ہوں، وقتاً فوقتاً اس کی تعریفیں کرتی ہوں اور پھر وہ وہی کرتا ہے جو میں چاہتی ہوں اور ساتھ ساتھ خود کو میرا نجات دہندہ سمجھ کر خوش بھی ہوتا رہتا ہے۔ اظفر کے ساتھ میں کوئی ایسی بری زندگی نہیں گزار رہی ہوں بلکہ سچ مانیے تو مجھے اس سے تھوڑی بہت محبت بھی ہوگئی ہے۔ ہو ہی جاتی ہے اگر ایک بندہ آپ کا اتنا تابعدار ہو پھر آپ کا شوہر ہو اور پھر آپ کے بچوں کا باپ بھی ہو۔ آپ ہی بتائیں، کیا تھوڑی بہت محبت ہونے کے لیے اتنی دلیلیں کافی نہیں ہیں اور پھر آپ یہ بھی تو سوچیں کہ ماضی کے بارے میں سوچ سوچ کر میں خود کو پاگل کس لیے کرتی۔ اگر مرد کبھی پچھتاوے کا شکار نہیں ہوتا تو پھر عورت کیوں ہو۔ اگر مرد ہر حال میں زندگی انجوائے کر سکتا ہے تو پھر عورت کیوں انجوائے نہ کرے۔ ٹھیک ہے؟

تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے اخبار میں شائع ایک خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے جب میں نے اپنے شوہر سے یہ کہا کہ عورت مرد سے زیادہ عقلمند ہوتی ہے تو میرے شوہر کا دل بے اختیار ہنسنے کو چاہنے لگا اور پھر میرے باہر آ جانے کے بعد یقیناً وہ بہت دیر تک اس بات پر ہنستا رہا ہو گا۔

اب تو یقیناً آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ اس کی ہنسی کی وجہ کیا ہے اور میں عورت کو مرد سے زیادہ عقل مند کیوں سمجھتی ہوں، اس کی وجہ بھی آپ سے مخفی نہیں ہے۔

عورت ہر بازی دل سے کھیلتی ہے مگر کبھی کبھار کوئی ایک بازی ایسی ہوتی ہے جسے وہ دماغ سے کھیلتی ہے اور اس وقت کم از کم اس بازی میں کوئی اس کے سامنے کھڑا رہ سکتا ہے، نہ اسے چت کر سکتا ہے۔ اور وہ بازی...... وہ بازی بقا کی بازی ہوتی ہے۔

☆......✪......☆

سحرایک استعارہ ہے

اس نے آج پھر مجھے فون کیا تھا۔

''مریم اسے کہو مجھے معاف کر دے ایک بار صرف ایک بار مجھ سے مل لے، مجھے اپنی شکل دکھا دے۔''

اس نے التجا کی تھی۔

''ایمن یہ میرے بس میں نہیں۔''

''کیسے تمہارے بس میں نہیں۔'' وہ بے اختیار چلائی تھی۔

''تم اسے کچھ کہو اور نہ مانے یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ تمہارے اشاروں پر چلتا ہے اور تم کہتی ہو یہ بات میرے بس میں نہیں یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم ایسا چاہتی ہی نہیں۔''

اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے فون بند کر دیا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا میں واقعی ایسا نہیں چاہتی تھی اور اگر میں چاہتی بھی تو جو دیواریں ان دونوں کے بیچ حائل تھیں انھیں پار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر اسے کس چیز کی کمی ہے جو وہ میری واحد خوشی کو بھی چھین لینا چاہتی ہے مگر اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، وہ مریم مر چکی ہے جو اپنے گلے سے پھولوں کے ہار اتار کر اس کے گلے کے کانٹوں کے ہار پہن لیا کرتی تھی اور اس مریم کا مر جانا ہی بہتر ہے۔

آنکھیں بند کیے کرسی پر جھولتے ہوئے میں مسلسل ایمن کے بارے میں سوچ رہی تھی اس کے فون نے، اس کی آواز اس کی التجا نے اس کے آنسوؤں نے یادوں کی ساری کھڑکیاں کھول دی تھیں اور میں انھیں بند کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

کبھی کبھی اچھا لگتا ہے۔

رات کے اس پہر یوں ماضی میں جھانکنا، جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کے پیروں کے نیچے کی زمین اب اپنی جگہ نہیں چھوڑے گی اور یہ جانتے ہوں کہ سر پر موجود آسمان آپ پر نہیں آن گرے گا۔ اب میں ماضی کو آنسوؤں کے ساتھ یاد نہیں کرتی، اتنا سکون اتنا قرار ہے میرے اندر کہ کوئی خلش مجھے بے قرار نہیں کرتی، کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا بہت بھلی لگ رہی ہے۔ کاش یہ یوں ہی ساری عمر مجھے سہلاتی رہے۔

''آپ نے پوری کہانی نہیں سنائی اور مجھے سلا دیا۔''

میرے کمرے میں اچانک ایک آواز ابھری تھی اسامہ نیم اندھیرے میں اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہا تھا پتا نہیں کس وقت اس کی آنکھ کھل گئی تھی مجھے بے اختیار اس پر پیار آیا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب بیڈ پر آ گئی اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔

''تم سو گئے تھے پھر کہانی کسے سناتی۔''

اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے میں نے کہا۔

''پھر اب سنائیں۔'' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں میں نے اس کا ماتھا چوم لیا گیٹ پر اچانک ہارن کی آواز سنائی دی تھی وہ واپس آ گیا تھا میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی رات کے دو بج رہے تھے۔

''کہانی سنائیں نا؟'' اسامہ نے مجھے خاموش دیکھ کر اصرار کیا۔

''سناتی ہوں بھئی سناتی ہوں۔''

''تمہیں یاد ہے کہاں تک سنائی تھی؟'' اس نے کہانی دہرانی شروع کی میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ داخلی دروازہ کھول کر اندر آ گیا ہوگا، میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی میں روز یہی کیا کرتی تھی۔

''اب وہ لاؤنج میں آ گیا ہوگا، ملازم نے اس سے چیزیں پکڑی ہوں گی۔'' سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آواز آ رہی تھی وہ میرے اندازے کے عین مطابق سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

میں جانتی تھی اب تھوڑی دیر میں وہ میرے کمرے میں آنے والا تھا۔ میں نے پیار سے اسامہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''شہزادی Palace کی کھڑکی میں بیٹھ کر روز رویا کرتی تھی مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آتا تھا پھر ایک دن وہاں سے ایک شہزادہ گزرا، اب آگے سنائیں۔'' اسامہ نے اپنی سنی ہوئی کہانی کا اعادہ کر دیا تھا اب وہ آگے سے کہانی سننے کا منتظر تھا۔

''پھر شہزادے نے شہزادی کو دیکھا.....'' میں نے کہانی شروع کی قدموں کی چاپ میرے دروازے پر رک گئی تھی اس نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔



وہ خوبصورت تھی بے حد خوبصورت تھی بلکہ بعض دفعہ میں سوچتی تھی کہ کیا دنیا میں کوئی اس سے زیادہ خوبصورت بھی ہو سکتا ہے اور میرا ایجک مرر مجھے ہمیشہ یہی بتاتا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہے، ہر ایک کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش ہوتی تھی اور مجھے اس پر رشک آتا تھا وہ خوبصورت تھی اور اسے اپنی خوبصورتی کا استعمال آتا تھا، میرے جیسے لوگ اس کے مداح تھے، اس کے معمول تھے وہ جو چاہتی کروا لیتی، مجھ سے چھوٹی تھی اس لیے لاڈلی تھی میری اکلوتی بہن تھی اس لیے بھی مجھے پیاری تھی اور صرف مجھے ہی نہیں سب کو ہی میں امی، ابا سب اس کو آسائش دینے میں لگے رہتے۔

''ایمن کو یہ چاہیے ایمن کو وہ چاہیے، ایمن کو یہ پسند نہیں ایمن کو وہ پسند نہیں۔'' یہ وہ جملے تھے جو ہر وقت گھر کے کسی نہ کسی فرد کی زبان پر رہتے اور ہم میں سے کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام نہ کرتا، آہستہ آہستہ پورا گھر اس کی مرضی سے چلنے لگا، گھر میں ہر کام اس کی پسند کے مطابق ہوتا، ہر چیز اس کی پسند سے آتی اس کی مرضی کے مطابق رکھی جاتی۔ اور یہ صرف گھر پر ہی بس نہیں تھا وہ مجھے بھی اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق استعمال کرتی تھی گھر میں جو چیز آتی پہلے انتخاب کا حق ایمن کو دیا جاتا پھر میری باری آتی اور پھر پتہ بھی نہیں چلا اور میں ہمیشہ جو چیز بھی لاتی اس میں سے بہترین چیز ایمن کے لیے علیحدہ کرنے کی عادی ہوگئی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر ایک جیسے جوتے یا کپڑے آتے تو ایمن اپنا سلوا کر خاص مواقع کے لیے محفوظ کر دیتی اور کسی عام سی جگہ پر جانے کے لیے بھی میرا والا سوٹ یا جوتا استعمال کرتی، مجھے کبھی اس پر اعتراض نہیں ہوا ہاں امی کو کبھی ہوتا تو وہ بڑے دھڑلے سے کہتی۔

''ہاں ایسے عام سے موقع پر اپنا سوٹ پہن کر خراب کرلوں۔''

''تو کیا مریم کا خراب نہیں ہوگا۔'' امی کہتیں۔

''اس کی خیر ہے اسے کون سا اتنا باہر آنا جانا ہوتا ہے۔''

میں ہمیشہ امی کو بات بڑھانے سے روک دیتی۔

''کوئی بات نہیں امی کچھ نہیں ہوتا۔'' مجھے اس سے کبھی بھی کوئی شکوہ نہیں ہوا تھا یہ تو عام سی چیزیں تھیں میں تو ضرورت پڑنے پر اس کے لیے جان بھی دینے سے گریز نہیں کرتی مگر ایسا موقع کبھی آیا ہی نہیں۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میری اس عادت نے کب اسے خود غرض بنا دیا کب اس نے میری ہر چیز ہر حق چھیننا عادت بنا لیا چونکہ مجھے اس سے کوئی حسد نہیں ہوتا تھا اس لیے تب بھی اعتراض نہیں ہوا جب میرے بچپن کے منگیتر سعد نے میری بجائے اس سے شادی پر اصرار کیا تھا۔

وہ میری خالہ کا بیٹا تھا باقاعدہ منگنی تو ہماری نہیں ہوئی تھی لیکن بچپن سے ہی ہر کوئی جانتا تھا کہ میری شادی سعد سے ہی ہوگی ہم دونوں میں آپس میں بہت ہی کم بات چیت ہوتی تھی بلکہ شادی ہی کبھی ہوئی ہو، وہ بہت کم گو تھا اور سنجیدہ بھی ہمارے گھر اس کا زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ شروع میں وہ پڑھائی میں مصروف رہا اور پھر بعد میں اس نے کاروبار شروع کر دیا تھا آہستہ آہستہ ان کے مالی حالات بہت اچھے ہوگئے تھے وہ ہماری طرح لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے خالو واپڈا میں سپرنٹنڈنٹ تھے وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اور MBA کرنے کے بعد اس نے کچھ دوستوں کے

ساتھ مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا تھا وہ لیدر جیکٹس بنوایا کرتا تھا اور بہت کم عرصے میں وہ لوئر مڈل کلاس سے نکل کر اپر مڈل کلاس میں آ گئے تھے۔

جب امی نے مجھ سے سعد کی ضد کا ذکر کیا تھا تو چند لمحوں کے لیے تو میں بے یقینی کے عالم میں انھیں دیکھتی رہی پھر میں نے وہی کہا تھا جو میں ہمیشہ کہتی تھی۔

''کوئی بات نہیں امی اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

اس بار امی نے مجھے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

''وہ تمہارا بچپن کا منگیتر ہے۔'' انھوں نے کہا تھا۔

''ہاں مگر اب وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو اسے مجبور تو نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہاں مجبور نہیں کیا جا سکتا تو پھر وہ کہیں اور شادی کرے تم سے نہیں تو ایمن سے بھی نہیں۔'' امی نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور میں چپ ہو گئی تھی، شاک مجھے ضرور لگا تھا مگر میں نے ہمیشہ کی طرح خود پر قابو پا لیا میں مضبوط تھی اس لیے یہ صدمہ بھی برداشت کر گئی۔

پھر ایمن میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ وہ بات بات پر جھگڑتی، لڑتی اور پھر رونے بیٹھ جاتی، پھر مجھے پتا چلا کہ وہ امی سے اس بات پر اصرار کر رہی ہے کہ وہ سعد کا رشتہ قبول کریں امی اس بات پر تیار نہیں تھیں اور وہ اتنی ہی بضد تھی پتا نہیں یہ سب مجھے اچھا لگا یا نہیں ہاں مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار امی سے ضد کی تھی۔ اور اپنی بات منوالی تھی۔

ایمن کی شادی سعد سے ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے میری دوست عالیہ اس بات پر بہت دیر تک مجھ سے لڑتی رہی تھی۔

''تم پاگل ہو چکی ہو مریم، تم واقعی پاگل ہو چکی ہو۔'' اس نے جاتے جاتے مجھ سے کہا تھا اور میں نے جواباً کہا تھا۔

''فاطمہ اس سے کیا ہو جائے گا، میں پہلے بھی اسے اپنی چیزیں دیتی رہی ہوں اور اب بھی سہی۔''

''سعد کوئی چیز نہیں ہے سمجھیں تم، دیکھنا تم بہت پچھتاؤ گی جب لوگ یہ پوچھیں گے کہ اتنے سال منگنی رہنے کے بعد تمہارے منگیتر نے تمھیں کیوں چھوڑ دیا تو پھر کیا کہو گی، ایمن جیسے لوگوں کو خود غرض بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ تم جیسوں کا ہوتا ہے سمجھیں تم۔''

''فاطمہ ویسے سعد کے ساتھ ایمن ہی سجے گی، ان دونوں کی جوڑی بہت خوبصورت لگے گی۔'' میں نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''بھاڑ میں جائے ان کی جوڑی اور تم بھی۔'' وہ دروازہ پٹخ کر باہر چلی گئی تھی مگر مجھے تب بھی کوئی ملال نہیں ہوا۔

ایمن شادی پر بہت خوبصورت لگ رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا سے آئی ہو میں نے خالہ کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں خالہ وہ کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔'' انھوں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر مجھے دیکھا اور کہا۔

''ہاں وہ صرف خوبصورت لگتی ہے۔''

میں ان کی بات نہیں سمجھی تھی اور سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی سعد اس شادی سے بہت خوش تھا میں نے زندگی میں پہلی بار شادی کے موقع پر اسے

قہقہے لگاتے دیکھا تھا اور اسے اتنا خوش دیکھ کر مجھے عجیب سی ندامت کا احساس ہوا تھا اگر مجھے یہ پتا ہوتا کہ مجھ سے پیچھا چھوٹ جانے پر وہ اتنا خوش ہوگا تو میں بہت پہلے یہ کام کر گزرتی۔

وہ دونوں بہت خوش تھے اور میں ان کی خوشی پر خوش تھی۔

سعد شادی کے بعد میرا سامنا کرنے سے کترایا کرتا تھا اور یہی حال میرا تھا، میں ان دونوں کو کسی مشکل لمحے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو کوشش کرتی کہ ان سے زیادہ سامنا نہ ہو۔

پھر زندگی اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے بی اے کرنے کے بعد ایک اسکول جوائن کر لیا تھا امی نے میرے کئی اچھے رشتے بھی معمولی سی خامی پر ٹھکرا دیے، حالانکہ میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ اب اتنی چھان بین کا کوئی فائدہ نہیں جب سعد نہیں تو پھر کوئی بھی سہی اچھا ہو یا برا اس سے کیا فرق پڑتا ہے، گزارنی تو زندگی ہی تھی اور وہ بہر حال گزر جاتی مگر میں امی سے یہ نہیں کہہ پائی۔

میں 24 سال کی ہوگئی تھی۔ زندگی آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی میری عمر بڑھانے والا ہر سال امی کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا مگر میں کیا کر سکتی تھی نہ میں وقت کے پہیے کو روک سکتی تھی نہ امی کی پریشانی ختم کر سکتی تھی ہاں اگر میں کچھ کر سکتی تھی تو وہ صبر تھا اور یہ کام میں برسوں سے کر رہی تھی۔

دن ایسے ہی گزر رہے تھے جب اچانک ہماری زندگی میں بھونچال آ گیا تھا وجہ اس بار بھی ایمن ہی تھی، وہ سعد سے طلاق چاہتی تھی اور اس کی کوئی معقول وجہ اس کے پاس نہیں تھی اس کی شادی کو چار سال گزر گئے تھے ایک بہت خوبصورت بیٹا بھی تھا اس کا، سعد کا کاروبار ترقی کر رہا تھا گھر میں اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی، سعد اس پر جان چھڑکتا تھا، پھر بھی وہ طلاق چاہتی تھی اور طلاق حاصل کرنے کے لیے وہ ہمارے پاس نہیں آئی بلکہ اپنی ایک دوست کے گھر اس نے رہائش اختیار کر لی وہ حدید کو بھی چھوڑ گئی تھی۔

سعد اور خالہ بے حد پریشان تھے اور ہم لوگ صرف پریشان نہیں تھے ہم پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

ہزار دقتوں کے بعد سعد نے اس کی رہائش گاہ کا پتہ چلایا تھا مگر اس نے سعد سے بات کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا اور اسی سلوک کا سامنا ہمیں کرنا پڑا جب سعد نے ہمیں اسے سمجھانے کے لیے بھجوایا تھا، پھر ہم ایک بار نہیں بیسیوں بار اسے سمجھانے کے لیے گئے تھے مگر اس نے ہمیشہ ہم سے ملنے سے انکار کر دیا اور آخری دنوں میں تو اس کا چوکیدار ہمیں دیکھ کر گیٹ بھی نہیں کھولتا تھا۔

پھر جب سعد نے اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا تو اس نے خلع کا کیس کر دیا۔ سعد کی حالت ان دنوں پاگلوں جیسی تھی اس کا بسا بسایا گھر اجڑ رہا تھا اور وہ اس کی تباہی دیکھنے پر مجبور تھا، وہ دن میں تین تین بار ایمن کے گھر جاتا کہ شاید وہ اس سے بات کر لے شاید وہ اپنی خفگی کی وجہ بتا دے مگر وہ اس کے سامنے نہیں آئی وہ اس کے وکیل کے سامنے گڑگڑا تا منت کرتا کہ وہ اس سے پوچھیں کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے اسے کیا چیز بری لگی ہے مگر اس کا وکیل ہمیشہ کہتا۔

”وہ کہتی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں وہ آپ سے طلاق چاہتی ہیں۔“

اور پھر وہی ہوا تھا جو ایمن نے چاہا تھا سعد نے بہت کوشش کی تھی کہ کیس کو لٹکا دیا جائے مگر ایسا نہیں ہوا ایمن کے وکیل بہت نامی گرامی

تھے۔اور وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔

کیس کورٹ گیا اور سعد کے کردار کے بارے میں ایمن کے وکیل نے بے شمار باتیں کہیں، انھوں نے جھوٹے گواہوں کے ساتھ کورٹ میں ثابت کر دیا کہ سعد ایک بدکردار شخص ہے جو بیوی کو مارتا پیٹتا ہے، اور اس کی کوئی ذمہ داری پوری نہیں کرتا اور اپنی بیوی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے میکے سے روپے لائے اور وہ ایمن کے کردار پر شک بھی کرتا ہے ایسے شخص کے ساتھ کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔

میں جانتی تھی سعد ایسا نہیں ہے وہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا میرے گھر والے جانتے تھے کہ یہ سب غلط ہے مگر عدالت میں اس کے خلاف گواہ موجود تھے، ثبوت تھے اور ایمن بس ایک بار کورٹ میں آئی تھی اور اپنی لاجواب اداکاری سے اس نے سب کو ہرا دیا تھا، آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی لیے آنکھیں جھکائے بکھرے بالوں اور لرزتی آواز کے ساتھ اس نے اپنے بیان سے کیس جیت لیا تھا۔

کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور اب ہمارے کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا، سعد فیصلہ سن کر وہیں عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا مگر ایمن کسی کو دیکھے بغیر ان ہی لوگوں کے ساتھ واپس چلی گئی تھی جن کے ساتھ وہ آئی تھی تب کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

"پچھلے ایک سال سے وہ بہت عجیب ہو گئی تھی، معمولی باتوں پر سعد سے جھگڑتی اس نے سعد سے بے تحاشا فرمائشیں شروع کر دی تھیں، سعد ان سب باتوں سے پریشان تھا، مگر پھر بھی وہ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔کچھ عرصہ پہلے اس کے پارٹنر نے اپنا بزنس الگ کر لیا تھا سو اسے مالی طور پر کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا تھا، پھر ایمن جو فرمائش کرتی اس نے بھی مالی طور پر اسے کافی نقصان پہنچایا تھا، پہلے وہ جتنا جیب خرچ اسے دیتا وہ اس پر ہی بہت خوش تھی کیونکہ وہ اس کی ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا مگر اب وہ جتنا بھی دیتا وہ خوش نہ ہوتی بلکہ ہر دو چار دن کے بعد کسی نہ کسی بہانے وہ مزید روپوں کا مطالبہ کر دیتی۔

وہ ہر وقت گھر سے باہر رہتی تھی اور حدید پر بھی اس کی توجہ کم ہو گئی تھی مگر ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح کرے گی۔"

خالہ نے خلع کے بعد ہمیں بتایا تھا حدید بہت چھوٹا تھا اور خالہ اسے سنبھال نہیں پاتی تھیں سو وہ اسے ہمارے گھر چھوڑ گئیں ہم لوگ خالہ اور سعد سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہے تھے بلکہ ہم تو کسی کا بھی سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ہر آنے والا یہی تذکرہ چھیڑ کر بیٹھ جاتا اور ہماری ندامت میں اضافہ کرتا جاتا۔

ایمن نے خلع کے بدلے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔جہیز کا سامان حق مہر حتیٰ کہ حدید کو بھی، وہ دو سال کا تھا اور ہر وقت روتا رہتا تھا مجھے اس پہ بے تحاشا ترس آتا اور میں سارا دن اسے اٹھائے پھرتی اس کی وجہ سے میں نے اسکول بھی چھوڑ دیا۔آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہو گیا مجھے اس سے اس لیے محبت تھی کہ وہ ایمن اور سعد کا بیٹا تھا اور اس لیے بھی کہ اس نے ماں کے ہوتے ہوئے بھی اسے کھو دیا تھا۔

میں جب بھی اس کا چہرہ دیکھتی، مجھے ایمن یاد آ جاتی، وہ بالکل اس کی کاربن کاپی تھا صرف رنگت کا فرق تھا ایمن سرخ و سفید تھی تو حدید سعد کی طرح گندمی رنگت کا تھا۔

''ہم نے سعد سے تمہارے نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔''

خلع کے ایک ماہ بعد ایک رات امی نے مجھ پر قیامت توڑی تھی۔

''جتنی ذلت اور رسوائی سعد کو ایمن کی صورت میں برداشت کرنی پڑی ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ میں تم سے اس کی شادی کروا کر ان داغوں کو ختم کر دوں جو ایمن نے اس کے کردار پر لگائے ہیں، لوگ سعد کے بارے میں جو شبہات رکھنے لگے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے تمہارے علاوہ حدید کی زندگی تباہ ہو جائے گی آخر شادی تو اسے کرنی ہی ہے تو پھر تم سے کیوں نہیں، پھر تمہاری خالہ اور سعد بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''سعد بھی یہی چاہتا ہے۔''میں نے سوچا تھا اور ہاں کر دی تھی۔

''ہاں واقعی حدید کو میرے علاوہ اور کون چاہ سکتا ہے؟''میرے ذہن سے ابھرنے والی دوسری سوچ حدید کے لیے تھی۔

میں نے زندگی میں کبھی کوئی مشکل کام نہیں کیا تھا (یہ میرا خیال تھا) اور میں نے سوچا تھا کہ اب مجھے ایک مشکل کام کرنا پڑے گا۔ سعد کو یہ یقین دلانا تھا کہ میں ایمن کی طرح نہیں کروں گی میں ایمن سے بہتر ہوں مجھے اس کے دل میں اور اس کے گھر میں اپنی جگہ بنانی تھی مگر مجھے یہ مشکل کام کرنا ہی نہیں پڑا جس سعد سے میری شادی ہوئی تھی عورت پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا اور میں بھی عورت تھی پھر ایمن کی بہن تھی یہ میری ذات کو اور بھی ناقابل یقین بناتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اس کی وہ سابقہ منگیتر تھی جسے وہ ٹھکرا چکا تھا۔

خالہ کو ہمیشہ مجھ پر یقین تھا اور بعد میں بھی رہا سو مجھے ان کا اعتماد جیتنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا، سعد کو نہ پہلے مجھ پر یقین تھا نہ بعد میں ہی کبھی ہونا تھا سو اس کا اعتماد جیتنے کی میری ہر کوشش بری طرح ناکام رہی وہ مجھ سے صرف کام بات کرتا تھا اور جب کرتا بھی تو جھڑکنے یا ڈانٹنے والے انداز میں وہ مجھ سے باقاعدہ لڑتا نہیں تھا شاید میں نے کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

وہ میری ذات سے ہمیشہ بے نیاز رہتا تھا جیسے میرے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور میں جانتی تھی کہ اسے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، اسے میری کسی ضرورت سے کوئی غرض نہیں تھی وہ ہر ماہ مجھے ایک محدود سی رقم تھما دیتا اور پھر پورا ماہ مجھے اسی رقم میں گزارا کرنا پڑتا تھا، میں اس سے کسی بات کا شکوہ اس لیے نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب میری اپنی بہن کا کھودا ہوا گڑھا تھا جس میں مجھے گرنا پڑا تھا۔ میں سعد کو اس رویے پر حق بجانب سمجھتی تھی سو مجھے کبھی اس سے شکایت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی ہر زیادتی پر مجھے ایک عجیب سی تسلی ہوتی کہ میں ایمن کی زیادتیوں کی تلافی کر رہی ہوں۔

ایمن نے سعد سے خلع کیوں لی تھی یہ بات زیادہ عرصہ راز نہیں رہی تھی، اس نے اپنی عدت پوری ہونے کے اگلے ہی دن سعد کے اس دوست سے شادی کر لی تھی جو اس کا بزنس پارٹنر تھا اور جس نے کچھ عرصہ پہلے سعد سے اپنا بزنس ختم کر لیا تھا یہ اس اقدام کے لیے تیاری تھی جو ایمن کرنے والی تھی۔

اظہر، سعد کا بہت گہرا دوست تھا عمر میں سعد سے کافی بڑا تھا مگر پھر بھی سعد سے اس کی بہت دوستی تھی اور وہ سعد کے گھر بہت آیا کرتا تھا۔ پتا نہیں ان دونوں کو ایک دوسرے میں کیا چیز اچھی لگی۔ شاید اظہر کو ایمن کی خوبصورتی نے گھائل کیا ہوگا اور ایمن اس کی دولت سے متاثر ہوئی ہوگی وہ بہت امیر تھا سعد شکل میں اس سے اچھا ہی مگر دولت میں وہ کسی طور بھی اس کے برابر نہیں تھا اظہر شادی شدہ تھا اور اس کے چار بچے تھے مگر اس نے

بھی ایمن سے شادی کرتے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

اور جب سعد کو اس شادی کی خبر ملی تھی تو اس پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا اس دن وہ بغیر کسی وجہ کے مجھ سے لڑ پڑا تھا اور پھر گھر کی جو چیز اس کے ہاتھ لگی اس نے توڑ ڈالی، برتن گملے، ڈیکوریشن پیسز، دیوار پر لگی ہوئی تصویریں ہر چیز، میں دم سادھے حدید کو گود میں لیے غم زدہ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی پھر وہ گھر سے چلا گیا خالہ اس کے جانے کے بعد بازار سے آئی تھیں میں اس وقت چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

''کچھ نہیں بس سعد کو غصہ آ گیا تھا'' میں نے ان کے استفسار پر بغیر ان کی طرف دیکھے جواب دیا تھا، میرے دل میں تب بھی سعد کے خلاف غصہ پیدا نہیں ہوا، میں جانتی تھی وہ صدمے کے عالم میں تھا اظہر اس کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہوا تھا، یہ چیز اسے برداشت نہیں ہو رہی ہو گی کہ اس کے اعتماد کا خون کیا گیا تھا، اور یہ سب اس کی ناک کے نیچے ہوا تھا اور اسے پتا نہیں چلا۔

پہلے عورت سے اس کا اعتماد اٹھا تھا پھر دوستی سے بھی اٹھ گیا میرے لیے زندگی پہلے بھی آسان نہیں تھی۔ ایمن کی شادی کے بعد اور بھی مشکل ہو گئی، سعد کا کاروبار کافی خراب حالت میں تھا، اس لیے اس نے کاروبار میں سرمایہ لگانے کے لیے گھر بیچ دیا۔ ہم تین کمروں کے ایک کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے سعد نے اپنی گاڑی بھی بیچ دی، مجھے اپنا زیور بھی بیچنا پڑا، بہت سے اخراجات میں ہمیں کمی کرنی پڑی مگر مجھے سعد سے کبھی کوئی شکوہ یا شکایت نہیں ہوئی، جو ہو رہا تھا وہ میری تقدیر میں تھا یہ میں سوچتی تھی۔

سعد کو کسی چیز پر اعتبار نہیں رہا تھا سارے رشتے اس کے لیے بے معنی ہو چکے تھے۔ میری ذات میں اسے پہلے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ایمن کی شادی کے بعد وہ خالہ اور حدید سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا اسے خالہ سے یہ شکایت تھی کہ انھوں نے ایمن پر نظر کیوں نہیں رکھی مگر خالہ اسے یہ سمجھانے سے قاصر تھیں کہ اس نے خود انھیں ایمن پر کوئی پابندی لگانے سے منع کر دیا تھا، اور اب وہ انھیں ہی قصوروار ٹھہراتا تھا۔ اسے حدید میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی اسے اٹھا لیا کرتا تھا اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا مگر ایمن کی شادی کے بعد جیسے اس کی پوری زندگی بدل گئی تھی۔ وہ رات دیر گئے گھر واپس آتا اور صبح سویرے چلا جاتا اور بعض اوقات تو وہ دو دو دن گھر نہ آتا، میں جانتی تھی کہ وہ اپنا سارا وقت اپنے کاروبار کو دیتا ہے اس لیے مجھے اس کے ان معمولات پر اعتراض نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کا کیا فائدہ ہوتا، میں کسی بھی طرح اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

وقت ایسے ہی گزر رہا تھا میری توجہ اور دلچسپی کا واحد مرکز حدید تھا اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا نہ ہی آئندہ کچھ آ سکتا تھا شادی کے فوراً بعد ہی سعد نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اب کوئی اولاد نہیں چاہتا اس کے لیے حدید ہی کافی ہے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا لیکن اس نے اتنی بری طرح مجھے جھڑکا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

میرے آنسوؤں نے اسے مزید بھڑکا دیا تھا اس نے کہا تھا۔

''یہ حربے مجھ پر استعمال نہ کرو یہ ڈراما بند کرو۔''

وہ نہیں جانتا تھا کہ میں حربے استعمال کرنے والوں میں سے نہیں ہوں یہ ہنر آتا ہوتا تو میری زندگی اتنی ناکام نہ ہوتی مگر خیر میں اسے کیا سمجھا سکتی تھی صرف خود کو سمجھا سکتی تھی سو میں نے خود کو سمجھا لیا۔

میں نے حدید کو کسی انتقامی جذبے کا نشانہ نہیں بنایا۔ اس کا فائدہ ہی کیا ہوتا جیسے میں کسی اور کی غلطی کی سزا کاٹ رہی تھی وہ کیوں کاٹتا۔

پھر آہستہ آہستہ زندگی قدرے بہتر ہوگئی تھی۔ سعد کا کاروبار بہتر ہونا شروع ہوگیا تھا اب وہ زیادہ باہر نہیں رہتا تھا، حدید کے ساتھ بھی اس کا رویہ ٹھیک ہوگیا تھا اور خالہ سے بھی اس کے گلے ختم ہوگئے تھے۔ مگر اگر کسی سے بے التفاتی کم نہیں ہوئی تھی تو وہ میں تھی اور مجھے اس سے کوئی توقع نہیں تھی میری ذات کا محور تو حدید تھا وہ میرا سب کچھ تھا، میرا دوست، میرا بیٹا، میرا ساتھی، میرا ہم راز، میرا غمگسار، میرا ہمدرد سب کچھ وہی تھا میں اپنی ہر بات اسے بتاتی جب اسے سلا رہی ہوتی یا اس کے ساتھ کھیل رہی ہوتی، اسے میری کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر مجھے لگتا جیسے وہ سب سمجھ رہا ہے۔

وہ واحد شخص تھا جو مجھ سے واقعی محبت کرتا تھا مجھے دیکھ کر جس کی آنکھوں میں چمک آتی تھی جو میرا لمس پا کر چلا آتا تھا اسے ہر کام میں میرا سہارا چاہیے ہوتا تھا میرے بغیر وہ کھانا تک نہیں کھاتا تھا، اور جب تک سب کچھ ایسا تھا مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں تھی۔

خالہ اس سے میرا پیار دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔

''اس سے ایسے ہی محبت کرتی رہنا دیکھنا تمہیں اس سے کتنا سکھ ملے گا یہ تمہیں رانیوں کی طرح رکھے گا۔''

میں ان کی بات پر گیلی آنکھوں سے ہنس دیتی۔

جب تک خالہ زندہ تھیں وہ میرے لیے بہت بڑا سہارا تھیں سعد مجھے ہمیشہ میری ضرورت سے کم روپے دیتا اور میں کبھی اس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرتی جب اس کا کاروبار بہت اچھا ہوگیا تھا تب بھی وہ مجھے پہلے جتنی رقم ہی دیتا تھا اور میرے لیے اس لگی بندھی رقم میں گھر چلانا کافی مشکل ہوجاتا تھا، تب خالہ میرے کام آتی تھیں سعد انہیں کافی روپے دیتا رہتا تھا اور وہ یہ سارے روپے مجھے دیتی رہتیں۔ پھر وہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئیں گھر ایک دم سونا سونا لگنے لگا تھا۔

وہ مرنے سے پہلے سعد کو بہت نصیحتیں کرتی رہی تھیں، اور ان سب نصیحتوں کا اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر یہ ضرور ہوا کہ اس نے مجھے میری ضرورت کے مطابق روپے دینے شروع کر دیے اور اکثر بغیر مانگے بھی وہ مجھے روپے دیتا رہا۔

کچھ عرصہ کے بعد میری امی کا بھی انتقال ہوگیا تھا باقی سب رشتہ داروں سے میں سعد کی وجہ سے پہلے ہی کٹ چکی تھی۔ سو اب بس حدید تھا جو میرا اکلوتا اثاثہ تھا وہ اسکول جانے لگا تھا اور جب تک وہ اسکول میں رہتا میں پورے گھر میں بولائی پھرتی، جب اس کے آنے کا وقت ہوتا تو میں گیٹ کے پاس چکر لگاتی رہتی اور جب وہ آجاتا تو مجھے لگتا جیسے سب کچھ واپس آ گیا ہے۔ جیسے ہر چیز اپنی جگہ پر آ گئی ہے وہ میرا تھا صرف میرا اس کی زبان پر اگر کسی کا نام آتا تو وہ میں تھی چہرے پر کسی کے لیے مسکراہٹ ابھرتی تو وہ میرا وجود تھا اردگرد کہیں بھی کوئی ایمن نہیں تھی۔ سعد بھی نہیں تھا بس میں تھی۔

حدید سعد سے زیادہ مانوس نہیں تھا ایسا کیوں تھا یہ میں نہیں جانتی حالانکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، میرے ساتھ اس کا سلوک جیسا بھی تھا مگر حدید سے وہ واقعی محبت کرتا تھا صرف ایمن کی شادی کے کچھ عرصے بعد اس نے حدید سے بے اعتنائی برتی تھی مگر بعد میں وہ بے اعتنائی ختم ہوگئی تھی مگر حدید پھر بھی اس سے کچھ الگ ہی رہنا پسند کرتا تھا، اور یہ احساس کہ حدید کے لیے سب سے اہم میں ہوں میرے لیے، بہت تسکین بخش تھا۔

ایمن کے بارے میں اس پورے عرصے میں مجھے کوئی خبر نہیں ملی تھی سوائے اس کے کہ وہ امریکا اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی اور اس خبر نے مجھے بہت سکون دیا تھا اس نے کبھی حدید کے ساتھ کوئی رابطہ رکھنے کی کوشش نہیں کی اور مجھے کبھی کبھار اس بات پر حیرت ہوتی تھی مگر میرے لیے یہ بات سکون کا باعث بھی تھی کیونکہ اس سے رابطہ رکھنے کی صورت میں حدید مجھ سے اتنی محبت بھی نہ کرتا سو اچھا ہوا اس نے حدید کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھا۔

حدید ماشاء اللہ بڑا ہو گیا تھا اس کا قد میرے برابر آ گیا تھا تب وہ نویں میں تھا اور وہ واضح طور پر ایمن سے مشابہت رکھتا تھا بس اس کی رنگت ایمن جیسی نہیں تھی۔ مگر اس کا مزاج ایمن جیسا ہی تھا وہ کافی بے صبرا تھا ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ میں ہر کام اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق کروں اور میں...... میں ویسے ہی کرتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ سعد کا کاروبار ترقی کرتا جا رہا تھا روپیہ جیسے اب اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا وہ جس کام کو ہاتھ لگاتا وہ اس کے لیے سونے کی کان بن جاتا اب ہم اس تین کمروں کے کرائے کے فلیٹ میں نہیں رہتے تھے بلکہ گلبرگ میں چھ کنال کے ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اب گھر میں تین تین گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں گھر میں ہر کام کے لیے نوکر تھے۔

میں ان سب چیزوں ان سب آسائشوں کو دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ یہ سب ایمن کا مقدر تھا اگر وہ کچھ انتظار کر لیتی تھوڑا صبر کر لیتی پھر کچھ بھی نہ بگڑتا اس کے غلط فیصلوں نے پہلے مجھے برباد کیا تھا پھر سعد کو بھی تباہ کر دیا، یہ آسائشیں میری تمنا نہیں تھیں یہ مجھے خوش نہیں کر سکتی تھیں، ایمن کی خواہش یہی چیزیں تھیں اور وہ یقیناً انھیں پا کر خوش ہوتی، مجھے محبت کی چاہ تھی اور سعد کی بجائے کسی اور مرد سے شادی کرنے کی صورت میں وہ مجھے مل جاتی سعد کو ایمن کی ضرورت تھی اور اس کمی کو دنیا کی کوئی چیز پر نہیں کر سکتی تھی۔ حدید جانتا تھا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں، میں نے اس بارے میں اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا، ہاں مگر میں نے ایمن کے بارے میں اس سے کہا تھا کہ وہ مر چکی ہے کیونکہ سعد یہی چاہتا تھا، پتا نہیں کیوں مگر حدید نے کبھی اپنی ماں کے بارے میں مجھ سے زیادہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

اس کی اپنی زندگی تھی اپنی سرگرمیاں تھیں اور وہ ان ہی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ بہت Brilliant اسٹوڈنٹ تھا، اور جتنا قابل تھا اتنا ہی محنتی تھا۔

مجھے بچپن میں اسٹڈیز کے معاملے میں اس پر کافی توجہ دینی پڑتی تھی۔ مگر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا وہ خود ہی اسٹڈیز کو بہت سنجیدگی سے لینے لگا میں چاہتی تھی وہ سول سروسز میں جائے مگر سعد یہ نہیں چاہتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتا تھا، اور چاہتا تھا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کا بزنس سنبھالے مگر حدید نے اپنی راہ خود چن لی تھی وہ پاکستان میں ہی اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا اور پھر سول سروس جوائن کرنا چاہتا تھا۔

''ماما میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا اور ویسے بھی جب بعد میں یہیں رہنا ہے تو اب کیوں باہر جاؤں۔'' اس کا جواب بڑا دو ٹوک تھا اور پھر سعد کے لاکھ کہنے اور چیخنے چلانے کے باوجود وہ باہر نہیں گیا۔

اس نے ایم بی اے کیا تھا اور پھر مقابلے کا امتحان پاس کر کے اس نے پولیس سروس جوائن کر لی تھی میں اس کے اس فیصلے سے بہت پریشان ہوئی تھی پولیس کی جاب میں ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا تھا اور میں حدید کو کسی صورت گنوانے پر تیار نہیں تھی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ تھا ہی

نہیں، مگر حدید میری بات ماننے پر تیار نہیں ہوا۔

مقابلے کے امتحان میں ٹاپ کرنے کے باوجود اس نے پولیس سروس ہی جوائن کی ان دنوں میں بہت خوش رہتی تھی وہ ٹریننگ کے لیے سہالہ میں تھا اور میں اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر بیٹھے محسوس کرتی تھی۔ اب میں کوئی بے سہارا عورت نہیں رہی تھی اب میں سعد کی محتاج نہیں رہی تھی۔ میرا اپنا بیٹا میرا بوجھ سنبھال سکتا تھا میرے پاس میرا حدید تھا۔

اور پھر جیسے کوئی معجزہ ہو گیا تھا، بہت آہستہ آہستہ مگر آخر سعد کے وجود پر جمی ہوئی، برف پگھلنے لگی تھی۔ وہ پہلے کی طرح مجھے نظر انداز نہیں کرتا تھا مجھ سے گاہے بگاہے بات کرتا رہتا وہ خاموشی جو اتنے سالوں سے اس پر چھائی ہوئی تھی یک دم ٹوٹ گئی تھی وہ ہر بات میں تو نہیں مگر زیادہ تر باتوں میں میری رائے لینے لگا تھا میں یہ سوچنے لگی تھی کہ آخر میری محنت رنگ لے آئی تھی، میرا صبر رائیگاں نہیں گیا دیر سے سہی مگر میں اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

وہ ڈیڑھ سال بہت اچھا گزرا تھا یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز اپنے ٹھکانے پر آ گئی ہو جیسے دنیا ایک دم روشن ہو گئی، میں، سعد اور حدید، کیا دنیا میں اس سے بڑھ کر کچھ تھا، کم از کم میرے لیے نہیں تھا، کیا تھا اگر عمر کے اتنے سال ضائع ہوئے تھے کیا تھا اگر سب کچھ گنوایا تھا زندگی اتنی سی محبت کے سہارے بھی بڑے آرام سے گزاری جا سکتی تھی۔ جو مجھے ملی تھی۔

میں ان دنوں حدید کے لیے رشتے دیکھنے میں مگن تھی۔ وہ چھبیس سال کا ہو گیا تھا اور میں چاہتی تھی کہ اب اس کا گھر بس جائے۔ شادی کے معاملے میں اس کی اپنی کوئی پسند نہیں تھی یہ کام اس نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا سعد ان دنوں ایک بزنس ٹرپ کے سلسلے میں امریکا گیا تھا اور وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ بہت مصروف ہو گیا تھا ان ہی دنوں حدید کی اے ایس پی کے طور پر پہلی پوسٹنگ ہوئی تھی اور وہ ایبٹ آباد چلا گیا گھر ایک دم بہت سونا ہو گیا تھا۔

سعد اپنے کاموں میں مصروف تھا اور رات دیر گئے واپس آتا اور بعض اوقات تو اسے دو تین ہفتوں کے لیے باہر جانا پڑ جاتا تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے تھے حدید ایک بار بھی گھر نہیں آ سکا وہ اپنی جاب میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ فون وہ مجھے اکثر کیا کرتا تھا اور ہر دفعہ جب میں اسے بلانے پر اصرار کرتی تو وہ مجھے اپنے مسائل بتاتا اور میں قائل ہو جاتی۔

پھر ایک دن اس نے مجھے فون کیا اور زیادہ تر سعد کے بارے میں ہی پوچھتا رہا، اس کا لہجہ بہت عجیب، بہت الجھا ہوا تھا، مجھے لگا جیسے وہ کچھ پریشان ہے، مگر پریشان کیوں تھا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے سوچا شاید گھر سے دوری اس کا باعث ہے اس لیے میں نے اسے جلد از جلد گھر آنے کو کہا۔

''آؤں گا ممی آؤں گا آپ فکر نہ کریں۔''

اس نے کہا تھا اور دو دن بعد وہ اچانک صبح سویرے گھر آ گیا تھا وہ بغیر ہمیں بتائے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

میں اس وقت سعد کو آفس کے لیے تیار کروا رہی تھی جب ملازم نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

میں فوراً اسے دیکھنا چاہ رہی تھی مگر پھر یہ سوچ کر دل پر قابو پالیا کہ وہ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے تھکا ہوا ہوگا۔ہم لوگ اس وقت ناشتہ کر رہے تھے جب سفید کرتے اور بلیک جینز میں ملبوس وہ نیچے آ گیا تھا وہ بہت خاموش تھا مجھے اور سعد کو بہت گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا ہمارے ساتھ اس نے ناشتہ کیا تھا پھر سعد جب آفس جانے لگا تو اس نے کہا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔آپ ابھی آفس نہ جائیں۔''

اس نے سعد سے کہا تھا اور پھر وہ دونوں مجھ سے کچھ کہے بغیر اسٹڈی میں چلے گئے میں کچھ دیر تک ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی رہی مگر پھر بے اختیاری ہو کر میں ان کے پیچھے گئی تھی۔ اسٹڈی کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا شاید حدید کوئی رازداری برتنا نہیں چاہتا تھا، اندر سے آنے والی آوازیں واضح تھیں۔

''تو آپ نے میری ماں کو طلاق کیوں دی؟''

مجھے لگا تھا چند لمحوں کے لیے زمین کی گردش تھم گئی تھی۔ میں نے زندگی میں بس ایک ہی جھوٹ بولا تھا اور وہ کہاں آ کر آشکار ہوا تھا، حدید کی آواز میں بہت برہمی تھی۔

''ہم دونوں میں انڈراسٹینڈنگ نہیں تھی۔'' کچھ لمحوں کے بعد سعد نے جواب دیا تھا۔

''کس انڈراسٹینڈنگ کی بات کر رہے ہیں آپ، جنھیں اب آپ نے بیوی بنا کر رکھا ہے کیا ان کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ ہے آپ کی؟''

حدید کی آواز میں تمسخر تھا میں نے دیوار سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''کیا تم ایمن سے ملے ہو۔'' سعد نے بہت ہلکی آواز میں سوال کیا تھا۔

''ابھی تک تو نہیں مگر ملوں گا ضرور۔'' حدید نے بلند آواز میں کہا تھا اور میرے دماغ میں بہت سالوں پہلے ایمن کی کہی بات گونجی تھی۔

''میں چیزوں کو چھینتی نہیں ہوں وہ خود میری طرف آ جاتی ہیں۔''

میں مزید کچھ سنے بغیر نیچے آ گئی تھی۔

''تو کیا میں حدید کو بھی کھو دوں گی۔'' میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر سوچا تھا۔

''تو پھر باقی رہے گا کیا؟'' بہت دیر تک میں خالی الذہنی کے عالم میں وہاں بیٹھی رہی عالیہ نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔

''جتنا خود کو اس سے بہلا لو جب اسے ماں کی یاد آئے گی تو تمہاری کوئی یاد باقی نہیں رہے گی۔''

''کیا واقعی ایسا ہی ہوگا؟'' میں نے خود سے پوچھا تھا، کافی دیر بعد سعد نیچے آیا تھا اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اپنا بریف کیس اٹھا کر چلا گیا میں اسے چھوڑنے دروازے تک نہیں گئی۔ بس اپنی اس مشکل کا حل سوچتی رہی، میں اس پر کیا پڑھ کر پھونکوں کہ وہ ایمن کو بھول جائے اس کے بارے میں بات تک نہ کرے، وہ بس وہی حدید بن جائے میری انگلی پکڑ کر چلنے والا۔

''نہیں میں اس پر ظاہر نہیں کروں گی کہ میں نے کچھ سنا ہے جب تک پردہ ہے پردہ ہی رہنا چاہیے۔'' میں نے بالآخر طے کیا تھا اس

دوپہر میں نے اپنے ہاتھ سے حدید کے سارے پسندیدہ کھانے پکائے تھے مگر اس سے پہلے کہ میں اسے جگانے جاتی وہ خود لاؤنج میں آ گیا تھا، وہ یونیفارم میں ملبوس تھا اور جب میں نے اسے کھانا کھانے کے لیے کہا تو ایک بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے کہا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے ایک ضروری کام ہے اس کے لیے مجھے جانا ہے۔'' میں نے بہت اصرار کیا تھا مگر وہ اپنا بیگ لے کر گیرج میں چلا گیا میں اس کے ساتھ ہی باہر آ گئی تھی۔

''اب کب آؤ گے؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔'' اس کا لہجہ بہت سپاٹ تھا۔ وہ کار کے کھلے دروازے پر ہاتھ جمائے مجھے دیکھتا رہا مجھے یوں لگا جیسے وہ جانے سے پہلے مجھے کچھ کہنا چاہ رہا تھا میں کٹہرے میں کھڑے مجرم کی طرح سزا سننے کے انتظار میں اسے دیکھتی رہی مگر اس نے کچھ نہیں کہا وہ گاڑی میں بیٹھ کر پہلی بار مجھے خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا اور میں بہت دیر تک کھلے گیٹ کو دیکھتی رہی۔ مجھے لگا جیسے وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

''نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اتنی محبت دی ہے اسے، اس کے لیے اپنی زندگی اپنی خوشیاں قربان کر دیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔'' میں نے خود کو تسلی دی تھی اور اندر آ گئی تھی۔

دن پھر گزرنے لگے تھے۔ میں ہر روز حدید کو فون کرتی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتی بالکل اس ڈوبنے والے کی طرح جو ڈوبنے سے پہلے ایک گہرا سانس ضرور لیتا ہے پتا نہیں میں کس کو دھوکا دے رہی تھی خود کو یا حدید کو میں نہیں جانتی بس میں یہ چاہتی تھی کہ کوئی ایمن میرے اور حدید کے درمیان نہ آئے مگر...... ایسا ہوا نہیں۔

حدید ایمن سے ملنے گیا تھا اس نے مجھے بتایا نہیں پھر بھی میں جان گئی۔ اب مجھے حدید کے آنے کی خوشی نہیں ہوتی تھی میں اسے دیکھتی اور ایک عجیب سا خوف مجھے اپنے حصار میں لے لیتا میں اسے دیکھتی رہتی مجھے لگتا ابھی وہ مجھ سے لاتعلقی کا اظہار کر دے گا ابھی وہ کہے گا کہ اسے مجھ سے نفرت ہے کیونکہ میں اس کی ماں نہیں ہوں مگر ایسا ہوا نہیں اس کا انداز بہت عجیب تھا، وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتا تھا بالکل اپنی ماں کی طرح۔

وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا تھا، پتا نہیں کیا ہوتا تھا اس کی آنکھوں میں، میرا دل چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر روؤں، اسے کہوں کہ میں نے اس پر کوئی ظلم نہیں کیا میں نے اس کی ماں سے کوئی زیادتی نہیں کی ہے مگر وہ کچھ پوچھتا ہی نہیں تھا، اس کی ماں زبان سے سب کچھ کہہ دیتی تھی وہ آنکھوں سے سب کچھ بیان کر دیتا تھا ایمن کی بات چبھتی نہیں تھی اس کی ان کہی مجھے خنجر کی طرح کاٹ دیتی تھی۔

ان ہی دنوں سعد مجھ سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا، وجہ کیا تھی میں نہیں جانتی تھی نہیں شاید میں جانتی تھی بس یقین نہیں کرنا چاہتی تھی حدید جب بھی آتا وہ سعد کے ساتھ تنہائی میں لمبی لمبی گفتگو کیا کرتا تھا اور بعض دفعہ وہ لڑ بھی پڑتا تھا۔ اس کی آواز اسٹڈی سے باہر تک آتی اور میرا دل دہل جاتا۔

میں نے کبھی دوبارہ ان کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی اتنا حوصلہ ہی کہاں تھا، اس عمر میں جب بڑے سے بڑے شخص کو بھی کچھ آرام مل جاتا تھا میں سکون سے محروم ہو گئی تھی، حدید نے ایک دن مجھے کہا تھا۔

''آپ...... آپ بہت احمق ہیں۔''

پھر وہ برہم انداز میں باہر چلا گیا تھا، یہ واحد جملہ تھا جس نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی ورنہ مجھے اس سے کبھی بھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی میں نے اس دن کچھ نہیں کھایا تھا۔

''ہاں میں واقعی احمق ہوں۔'' اپنے چہرے کی جھریاں گنتے ہوئے میں نے اس دن اپنے آپ سے کہا تھا۔

''حدید نے کہا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا وہ غلط کہاں کہتا ہے۔''

اس دن سعد آفس نہیں گیا تھا، میں بہت حیران تھی سعد تو بیمار ہونے کی صورت میں بھی آفس کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا مگر اس دن تو اس نے بغیر کسی وجہ کے چھٹی کر لی تھی، وہ صبح دیر تک سوتا رہا پھر دوپہر کے قریب وہ کھانا کھانے کے لیے نیچے آیا تھا۔ بہت بے ڈھنگے انداز میں اس نے کھانا کھایا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر کہیں اور ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے مجھے کہا تھا۔

''تم اوپر آؤ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

میرا سانس رک گیا تھا۔

''اب اسے مجھ سے کیا باتیں کرنی ہیں؟'' مگر میں اس کی بات سننے کے لیے چلی گئی تھی اس نے مجھے کہا تھا۔

''میری بات غور سے سننا مریم، صبر سے اور حوصلے سے۔'' پھر اس نے مجھے دیکھے بغیر ایک لفافہ میرے پاس بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

''تم اچھی ہو بہت اچھی ہو مگر میں ایمن سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں، اس کے بغیر میں نے جتنے سال گزارے ہیں جہنم میں گزارے ہیں اور میں اب اس جہنم سے تنگ آ گیا ہوں تھک گیا ہوں، میں تمھیں طلاق نہیں دینا چاہتا تھا مگر اس کے بغیر میں ایمن سے شادی نہیں کر سکتا، اس لیے میں نے تمھیں طلاق دے دی ہے۔ تین دن پہلے میں نے ایمن سے شادی کر لی ہے۔''

اس لفافے میں طلاق کے کاغذات ہیں ایک فلیٹ کے کاغذات بھی ہیں اور کچھ چیکس بھی، تمھیں کوئی مالی مسئلہ نہیں ہوگا، اس گھر سے تم جو لے جانا چاہتی ہو لے جاؤ، جتنا لے جانا چاہتی ہو لے جاؤ تمھیں اجازت ہے۔''

میں بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ میرے قریب بیڈ پر بیٹھا تھا اس کے اور میرے درمیان بس وہ لفافہ تھا اور یہ فاصلہ کتنا طویل تھا۔

''تم نے تو اس سے دھوکا کھایا تھا۔'' مجھے اپنی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی سنائی دی تھی۔

''میں نے اسے معاف کر دیا ہے، وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور پھر غلطی تو ہر ایک سے ہو جاتی ہے۔'' وہ کتنا پرسکون تھا کتنا عظیم تھا، وہ سب کی غلطیاں معاف کر دیتا تھا، ایمن سب کی غلطیاں معاف کر دیتی تھی، حدید سب کی غلطیاں معاف کر دیتا تھا اور اللہ سب کی غلطیاں معاف کر دیتا تھا، بس ایک میں تھی جسے کوئی بھی بخشنے پر تیار نہیں تھا۔

''اور حدید۔'' میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ بھی یہی چاہتا ہے۔'' کوئی چیز میرے گالوں کو بھگونے لگی۔

''وہ بھی یہی چاہتا ہے۔''میں نے زیرلب دہرایا تھا پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی میں کمرے سے باہر آ گئی۔

''مریم یہ پیپرز لے لو۔'' اپنے پیچھے مجھے سعد کی آواز سنائی دی تھی مگر میں چلتی رہی۔

''مریم میں کہہ رہا ہوں یہ لے لو۔'' وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں انھیں کیا کروں یہ مجھے کیا دیں گے۔''میں نے اسے کہا۔

''میں نہیں جانتا تم تماشا نہ کرو بس یہ لے لو۔''اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا میں نہیں جانتی پھر مجھے کیا ہوا تھا بس میں پاگلوں کی طرح چلاتے ہوئے اسے بددعائیں دینے لگی تھی۔

''اللہ کرے سعد تم مر جاؤ سب مر جاؤ ایمن، تم، حدید سب یہ گھر برباد ہو جائے۔ میں کیا کروں اس لفافے کو لے کر بتاؤ، میں کیا کروں، تم نے اس عمر میں میرے سر سے چادر کھینچ لی ہے، میرا بیٹا چھین لیا ہے، مجھے گھر سے محروم کر دیا ہے اور تم کہتے ہو میں یہ لفافہ لے لوں کیا یہ ان سب چیزوں کی کمی پوری کر دے گا لاؤ، لاؤ میں لے لیتی ہوں اسے لے لیتی ہوں۔''

میں نے بات کرتے کرتے لفافہ اس سے جھپٹ لیا تھا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سیڑھیوں میں پھینک دیے، سعد وہیں سیڑھیوں میں ہی کھڑا رہا تھا وہ میرے پیچھے نہیں آیا میں بلند آواز سے روتی باتیں کرتی ہوئی نیچے اتر آئی گھر کے سب نوکر ہکا بکا مجھے دیکھ رہے تھے، شاید وہ جان گئے ہوں گے کہ اب میری اوقات اس گھر میں ان کے برابر بھی نہیں رہی تھی میرے مالک میرے آقا نے مجھے نکال دیا تھا اور وہ بھی تب جب مجھے ایک چھت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی کوئی اس عمر میں کسی کو اس طرح بے عزت کرتا ہے جیسے اس نے مجھے کیا۔

میں لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں گی؟ میں کیا جھوٹ بولوں گی؟ میں کیا بتاؤں گی؟ سوالوں کی ایک آگ میرے وجود کو جلا رہی تھی میں نے کون سی نیکی کون سا ایثار نہیں کیا مجھے اس کا کیا اجر ملا؟

''میں نے تمھارے لیے کون سی قربانی نہیں دی، تمھاری کون سی اذیت برداشت نہیں کی، پچھلے پچیس سالوں سے تمھارے ساتھ رہی ہوں، یہ ایمپائر تم نے میری وجہ سے کھڑی کی ہے۔ یہ گھر یہ گاڑیاں یہ دولت تمھارے جسم پر موجود کپڑے تک میری بدولت ہیں۔ میری قربانی، میرے ایثار، میرے صبر کی بدولت ورنہ تم تھے کیا، میں نے حدید کو راتوں کو جاگ جاگ کر پالا ہے، میں نے اسے چلنا اسے ہنسنا اسے بولنا سکھایا ہے، میں نے اسے اس قابل بنایا ہے جو وہ آج ہے، تم نے نہیں ایمن نے نہیں، تم لوگوں نے تو بس اسے پیدا کیا ہے، مگر وہ نمک حرام، احسان فراموش تھا، آخر تم لوگوں کا خون تھا اسے یہ سب تو کرنا ہی تھا، میں ہی بھول گئی کہ وہ بھی سانپ ہے تمھارے جیسا ایمن جیسا۔''

میں بلند آواز سے چلاتی ہوئی الٹے قدموں لاؤنج سے نکل گئی تھی وہ میرے پیچھے نہیں آیا کوئی بھی میرے پیچھے نہیں آیا، میں پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

پچیس سال کے جمع کیے ہوئے آنسو آج ابل پڑے تھے پھر انھیں روکنا ان پر بند باندھنا میرے بس سے باہر تھا، اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے، مجھے یقین نہیں آتا تھا اس بات پر مگر حدید نے اسے ثابت کر دیا تھا، پتا نہیں میرا دوپٹہ اور جوتا کہاں رہ گئے تھے مجھے بس یہ یاد ہے کہ میں کسی

سڑک پر بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ گاڑیاں مجھے سامنے دیکھ کر بریک لگاتیں ان کے ڈرائیو اونچی آواز سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے اور میں بس بھاگتی جارہی تھی۔

پتا نہیں میں کب تک اس طرح بھاگتی رہی، ہاں مجھے یاد ہے کہ اس وقت اندھیرا تھا اور میں شہر سے باہر جانے والے کسی راستے پر سڑک کے کنارے گر کر رونے لگی تھی، مجھے حدید یاد آرہا تھا، اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میں نے اس سے کتنی محبت کی ہے۔ ساری ساری رات میں اسے گود میں لے کر بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اسے خراش آتی تو مجھے لگتا تھا جیسے کسی نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تو مجھے لگتا دنیا ڈوب رہی ہے وہ ایک وقت کھانا نہ کھاتا تو مجھے سارا دن بھوک نہ لگتی۔

''وہ بھی یہی چاہتا ہے۔'' سعد کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں اوندھے منہ کچی زمین پر پڑی بلک رہی تھی۔

''تم بھی ایمن کے ہو، سعد بھی ایمن کا ہے تو میرا کیا ہے، میرا کیا ہے، اب تمہاری ساری محبت ساری توجہ ایمن کے لیے ہوگی، وہ تمہاری شادی کرے گی تمھارے بال بچے پالے گی اور پھر جب بوڑھی ہوگی تو تم اس کو ہتھیلیوں پر اٹھا کر رکھو گے اور میں یونہی رلتی پھروں گی۔''

میں خود سے باتیں کر رہی تھی اور ہر بات میرے دل پر ایک اور خراش لگا رہی تھی۔

''اماں! اماں! کون ہو تم؟ یہاں اس طرح کیوں رو رہی ہو؟ آئی کیسے ہو یہاں۔'' ایک آواز نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، ایک لمبا سا آدمی میرے سر پر کھڑا تھا۔

سڑک پر کھڑی اس کی ٹرالی کی لائٹس روشن تھیں اور اس روشنی میں اس کی صورت بہت واضح تھی۔

''میرا شوہر فوت ہو گیا ہے آج میرے بیٹے نے مجھے گھر سے نکال دیا۔'' پتا نہیں میں نے کیا سوچا تھا اور یہ کہا تھا۔ پتا نہیں میں نے کیوں کہا مگر مجھے یاد ہے میں نے بہت بلند آواز سے جیسے کوئی گلہ اس سے کیا تھا اس نے مجھے کہا تھا۔

''دفع کرو اماں ایسی اولاد کو، اولاد نہ ہوئی کتا ہو گیا۔ تم میرے ساتھ چلو میں تمھیں اپنے پاس رکھوں گا۔''

''پتا نہیں مجھے کیا ہوا تھا مگر میں ایک دم اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی اس نے اپنی چپل مجھے پہنا دی اور پھر ٹرالی میں بٹھا کر ایک چادر نکال کر مجھے اوڑھا دی سارے راستے ٹرالی چلاتے ہوئے وہ مجھے پتا نہیں کیا بتاتا رہا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیا تھا پھر وہ مجھے اپنے گھر لے آیا تھا۔

گھر میں اس کی اپنی ماں بھی تھی، مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی مگر میرے تعارف نے اس کے چہرے پر نرمی بکھیر دی تھی اس نے مجھے لپٹا لیا تھا۔

''تینوں رون دی کی لوڑ اے گھروں کڈیا اے دنیا وچوں تے نہیں، توں ساڈے نال رہے جو روٹی ٹکر اسی کھانے آں تو وی کھالئی۔''

(تمھیں رونے کی کیا ضرورت ہے گھر سے نکالا ہے ناں، دنیا سے تو نہیں، تم ہمارے ساتھ رہو جو دال روٹی ہم کھاتے ہیں تم بھی کھا لینا۔) میں سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

''اپنی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے اور اس پر ایسا ہی مان ہوتا ہے۔ جیسا اسے ہے کتنے آرام سے کہہ رہی ہے کہ میں اس کے پاس رہ جاؤں اور ایک میں ہوں کہ......'' میری سوچوں کا سلسلہ اس کی آواز نے توڑ دیا تھا۔

''توں اندر آ میں تینوں کپڑے دینی آں او بدل لے تے نالے روٹی وی کھالے۔''

(تم اندر آ جاؤ میں تمھیں کپڑے دیتی ہوں وہ بدل لو اور کھانا بھی کھالو۔)

پھر اس نے میرے کپڑے بدلوائے تھے اور زبردستی چند لقمے مجھے کھلا دیے تھے پھر اپنے پاس ہی اس نے میری چارپائی بچھا دی، میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی کچھ بھی نہیں تھا نہ خواب نہ امیدیں اور نہ ہی آنسو سب کچھ ختم ہو گیا بس میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔

اس کے بیٹے کا نام اکبر تھا وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا، اکبر سے چھوٹی دو بہنیں تھیں اور وہ تینوں شادی شدہ تھے اکبر کے تین بچے تھے دو بیٹے اور ایک بیٹی اور اس کی بیوی اس دن بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی، اکبر کے باپ کا کافی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اور اس کی وفات کے بعد اکبر ہی اس کی زمینوں پر کاشت کاری کرتا تھا، وہ کوئی بہت بڑا زمیندار نہیں تھا بس اوسط حیثیت کا مالک تھا لیکن وہ سب خوش تھے اس سے بھی جوان کے پاس تھا اور اس پر بھی جوان کے پاس نہیں تھا۔

پتا نہیں میں وہاں کتنے دن رہی، وقت یک دم میرے لیے اپنے معنی کھو چکا تھا بلکہ ہر چیز ہی اپنی اہمیت کھو چکی تھی، بس مجھے یہ پتا تھا کہ میں زندہ ہوں اس سے آگے کیا تھا کچھ معلوم نہیں، میں روتی نہیں تھی میں ہنستی بھی نہیں تھی بس میں خاموش رہتی تھی سارا دن کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہتی کوئی زبردستی کھانا کھلاتا تو چند لقمے زہر مار کر لیتی، کوئی کپڑے بدلواتا تو بدل لیتی اور بس۔

اکبر مجھے کہتا کہ میں اسے اپنا بیٹا سمجھوں مگر میں ایسا کیسے کرتی جسے بیٹا سمجھا تھا اس نے کیا کیا، اسے بیٹا سمجھتی تو وہ بھی کچھ ویسا ہی کرتا اس کی بیوی اور بچے بھی میرا بہت خیال کرتے تھے۔ بار بار میرے پاس آتے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے مجھے اپنے ساتھ باتیں کرنے پر اکساتے مگر مجھے یہ سب نہیں آتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے تو ہر وقت حدید کا چہرہ رہتا تھا۔

میں سوچتی تھی اس وقت وہ سب کیا کر رہے ہوں گے یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ سعد، ایمن، حدید ان کا خاندان تو مکمل ہو گیا تھا، جو بچھڑا تھا مل گیا تھا وہ سب خوب ہنستے ہوں گے، ایمن اور سعد کو حدید پر فخر ہوگا کہ اس نے اپنے ماں باپ کو ملا دیا اور حدید خوش ہوگا کہ اسے اس کی ماں مل گئی تھی پھر میری اسے ضرورت ہی کیا رہ گئی تھی واقعی ماں تو ماں ہی ہوتی ہے اور میں تو بس آیا تھی پالنے والی کا احسان ہی کیا ہوتا ہے جو میں جتاتی۔

سوچیں سانپوں کی طرح میرے ذہن کو ڈستی رہتی تھیں اور میں تاریک کمرے کے ایک کونے میں آنکھیں بند کیے پڑی رہتی۔

نہ جانے کتنے دن گزر گئے تھے مجھے اس اندھیرے تاریک کمرے میں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا پھر ایک دن دل چاہا وہاں سے نکلنے کو، سورج کی روشنی دیکھنے کو، اس کی حدت محسوس کرنے کو اور میں اٹھ کر باہر آ گئی تھی چند لمحوں کے لیے روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا پھر آہستہ آہستہ آنکھوں کو کھولتے ہوئے میں نے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

دور ایک کونے میں اکبر کی بیوی تندور میں روٹیاں لگا رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر اس کے بچے چوزوں کے ساتھ کھیل رہے تھے میں آہستہ آہستہ اور باہر آ گئی کچی زمین کو مٹی سے لیپا گیا تھا بہت اچھا لگا تھا مجھے اس نیم گرم زمین پر ننگے پاؤں چلنا صحن کے وسط میں آ کر میں زمین کو ٹٹولتی رہی پھر میں ٹانگیں سکیڑ کر کروٹ کے بل زمین پر لیٹ گئی۔

نیم گرم زمین نے میرے جسم کو عجیب سا سکون دیا تھا، میں اس طرح ٹانگیں سکیڑے آنکھیں بند کیے زمین پر پڑی رہی۔

''ماں چارپائی بچھا دیتی ہوں یہاں زمین پر کیوں لیٹ گئیں؟'' اکبر کی بیوی کی آواز اچانک میرے قریب ابھری تھی۔

''نہیں ٹھیک ہے۔'' میں نے نامکمل سا جواب دیا تھا کچھ دیر تک وہ اصرار کرتی رہی مگر میرے خاموش رہنے پر وہ چلی گئی تھی۔ جان گئی تھی کہ میں وہی کروں گی جو چاہتی ہوں تھوڑی دیر بعد کسی نے ایک گرم چادر مجھ پر اوڑھائی تھی میں جانتی تھی یہ اکبر کی بیوی ہوگی، میں نے چادر سے اپنے چہرے اور کندھوں کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔

ایک عجیب سی خاموشی اور سکوت تھی ہر طرف کبھی کبھی اس خاموشی کو اکبر کے بچوں کی آوازیں توڑ دیتی تھیں مگر پھر ان کی ماں ڈانٹ کر انھیں خاموش کرا دیتی تھی۔

کیا میں نے کبھی سوچا تھا کہ میری منزل یہ ہوگی، ماربل کے فرش پر چلتے چلتے میں خاک کی زمین پر سونے لگی تھی، اگر میری زمین کا حاصل یہی ہوتا تو پھر یہ پچھلے پچیس سال کی محنت کس لیے، میں نے ان سے کیا پایا اور جو یوں ہونا تھا تو یوں ہی سہی آخر اس میں بھی برا کیا ہے کس کس کا ماتم میں کتنی دیر مناؤں گی۔ سعد کا، ایمن کا، گھر کا یا پھر حدید کا، مجھے پھر حدید یاد آ گیا تھا، ہر بات کا سلسلہ وہیں جا کر رکتا تھا، ہر تان وہیں ٹوٹتی تھی، نہ جانے وہ کیا کر رہا ہوگا پتا نہیں اسے میرا خیال بھی آتا ہوگا کہ نہیں کبھی کبھی تو مجھے یاد کرتا ہوگا۔

میں نے ایک خوش فہمی سے خود کو بہلانا چاہا، کتنا خوش ہوگا وہ ایمن کے ساتھ، اس کی یہ کمی بھی پوری ہوگئی تھی، میں واقعی احمق تھی جو یہ سمجھتی رہی کہ میں نے اس کی ہر کمی پوری کر دی ہے اب وہ میرے علاوہ کسی کے بارے میں سوچتا ہی نہیں ہوگا، مگر ایسا نہیں تھا میں نے چہرے پر سے چادر ہٹائی۔

''ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔'' کسی کی آواز میرے پاس گونجی تھی میں نے پھر چادر سے چہرے کو ڈھانپ لیا، کوئی میرے قریب آیا تھا پھر کسی نے میرے پیروں پر ہاتھ رکھا تھا، میں نے سوچا یہ اکبر کا چھوٹا بیٹا ہوگا وہ اکثر پیروں سے ہی کھیلتا تھا، میں نے اسے روکا نہیں بس اسی طرح لیٹی رہی پھر کسی نے اچانک میرے پیروں کو چومنا شروع کر دیا، میں ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

میرے پیروں میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا شخص حدید تھا صرف ایک لمحے کے لیے میں ساکت ہوئی تھی، پھر تیزی سے میں نے اپنے پیر کھینچ لیے وہ سیدھا ہو گیا، میری اور اس کی نظریں ٹکرائیں تھیں، بہت عجیب سی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں۔

''آپ کہاں چلی گئی تھیں مجھے اس طرح چھوڑ کر۔''

میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اٹھنے کی کوشش کی اس نے مجھے روکنے کے لیے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا مگر میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''مجھے ہاتھ نہ لگاؤ تم میرے لگتے کیا ہو۔'' میں غرائی اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہو گیا تھا بہت بے یقینی کے عالم میں اس نے مجھے دیکھا، میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ کو ہوا کیا ہے؟'' وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں پاگل ہوگئی ہوں۔''میں نے یہ کہتے ہوئے اندر جانے کی کوشش کی تھی۔

''ممی۔''میں اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

''مجھے ممی مت کہو، تمہاری ماں نہیں ہوں، تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تمہاری ماں وہ ہے جس کے لیے تم نے مجھے طلاق دلوادی۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔''

میں نے جواب دیے بغیر اندر جانے کی کوشش کی مگر اس نے میرے بازو پکڑ لیے۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں کیا غلط فہمی ہوگئی ہے آپ کو میرے خلاف۔''وہ میرے بازو پکڑے گڑگڑا رہا تھا مگر میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی تھی نہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر اس نے مجھے بہت مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا میں کسی طرح بھی اس سے خود کو نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت مجھ پر سوار ہوگئی تھی پتا نہیں کیا ہوا کہ میں نے خود کو چھڑانا بند کر دیا اور پھر پتا نہیں کیسے میں اسے مارنے لگی تھی میں نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر مگر اس نے مجھے چھوڑا نہیں نہ ہی مجھے روکنے کی کوشش کی بس خاموشی سے مار کھاتا رہا۔

میرا دل چاہ رہا تھا میں اس کی خوبصورت شکل بگاڑ دوں وہ چہرہ جو ہمیشہ مجھے ایمن کی یاد دلاتا تھا میں اس چہرے کو مٹا دینا چاہتی تھی اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا، ناک میں سے خون نکلنے لگا تھا چہرے پر جا بجا میرے ناخنوں سے پڑنے والی خراشیں نظر آ رہی تھیں قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے مگر وہ بڑی ثابت قدمی سے اسی طرح مجھے پکڑے ہوئے مار کھاتا رہا۔

صحن میں اکبر سمیت اس کا پورا خاندان کھڑا تھا، دیوار پر ہمسایوں کی کچھ عورتیں جھانک رہی تھیں وہ سب بے حس و حرکت یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے اسے بہت مارا تھا، بہت گالیاں دی تھیں وہ سب جو پچھلے پچیس سال سے میرے اندر جمع ہو گیا تھا وہ میں اس دن نکال رہی تھی وہ سب جو میں دوسروں سے کہنا چاہتی تھی وہ میں نے اسے کہہ دیا تھا۔

اسے مارتے مارتے میرے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ میری ساری ہمت جواب دے گئی تھی اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں رہی تھی میں نے پوری زندگی اسے سخت ہاتھ نہیں لگایا تھا اب میں اسے مار رہی تھی، آخر میرے ہاتھ رک گئے، میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور میں جیسے زمین پر ڈھے گئی تھی اس نے اپنا جوتا اتار کر میرے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی تھی۔

''اور مارنا چاہیں تو اس سے ماریں۔''اس نے کہا تھا میں نے جوتے کو پرے دھکیل دیا اور چیخیں مار مار کر رونے لگی تھی، اس نے مجھے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی پتا نہیں میں کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ جب آنسو نکلنا ختم ہو گئے اور میں نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی تھی تو اسے اپنے پاس پایا تھا، اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا تھا میں نے اسے روکا نہیں صحن میں اب کوئی بھی نہیں تھا، نہ ہی دیواروں پر عورتیں تھی پتا نہیں سب کہاں چلے گئے تھے۔

حدید اٹھ کرنل کے پاس چلا گیا تھا پھر ایک گلاس میں وہ پانی لایا تھا، مجھے گلاس تھمانے کے بجائے اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیا تھا۔

''بس۔'' میں نے گلاس کو ہاتھ سے پرے کیا تھا اس نے باقی پانی خود پی لیا تھا، پھر اس نے میرے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر لپیٹ دیا تھا اور کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی چادر لا کر مجھے اوڑھا دی میں بغیر کسی مزاحمت کے ایک مجسمے کی طرح بیٹھی رہی۔

وہ دوبارہ نل کے پاس آ گیا تھا اور اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا تھا پھر گیلے ہاتھوں سے اس نے اپنے بال سلجھائے، جیب سے رومال نکال کر اس نے اپنا چہرہ اور ہاتھ صاف کیے، کچھ دیر تک وہ اپنی شرٹ کے اوپر والے ٹوٹے ہوئے بٹنوں والی جگہ کو کسی طرح ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا رہا تھا پھر اس نے انھیں کھلا چھوڑ دیا اور گلے میں باندھا ہوا رومال نکال دیا۔

میں خاموشی سے دور بیٹھی اسے تکتی رہی پھر وہ میرے پاس آنے کی بجائے اندر چلا گیا تھا اور کچھ دیر بعد میرے لیے ایک چپل کے ساتھ برآمد ہوا تھا اس کے پیچھے اب کی بار اکبر کے گھر والے بھی تھے، اس نے چپل میرے پاس رکھ دی اور پھر ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا ہونے میں مدد دی تھی، میں نے اس کے کہنے سے پہلے ہی چپل پہن لی۔

''کنا سونا پتر اے تیرا اے تیرے بندے نے گھروں کڈ دتا ہے، تے کاغذ دے دتا اے تو فیر وی توں فکر نہ کری، تیرے کول تیرا پتر اے اللہ عمر دے۔'' (کتنا خوبصورت بیٹا ہے تمہارا، اگر شوہر نے گھر سے نکال کر طلاق دے دی ہے تب بھی فکر مت کرنا، تمھارے پاس تمہارا بیٹا ہے۔ اللہ اس کو زندگی دے۔)

اکبر کی ماں نے مجھ سے لپٹ کر کہا تھا، میں چپ رہی تھی، تو آخر ان کو حقیقت کا پتا چل ہی گیا میں نے اس کی بات پر سوچا تھا۔

''تسی میرے اتے بڑا احسان کیتا ہے، میں ایس احسان وا بدلہ نہیں دے سکدا، فیر وی اگر کدی تاں نوں میری ضرورت پوے تو آ جائیوں میرے کولوں جو ہووے گا میں کراں گا۔''

حدید بڑی رواں پنجابی میں اکبر سے مخاطب تھا اور میں چونک اٹھی تھی، اسے تو پنجابی نہیں آتی تھی، بچپن سے لے کر اب تک میں نے کبھی اس سے پنجابی میں بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کبھی پنجابی بولتے سنا تھا اور آج وہ بڑے آرام سے پنجابی میں مخاطب تھا۔ مجھے واقعی حدید کے بارے میں کم معلومات تھیں میں نے مایوسی سے سوچا تھا، وہ اکبر اور اس کی ماں سے باتوں میں مصروف تھا اور میں سوچوں میں۔

''آخر مجھے اس کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے اور آخر میں جا کیوں رہی ہوں، یہ مجھے لینے آیا کیوں ہے اور یہ مجھے اپنے پاس لے جا کر کیا کرے گا۔'' سوالوں کا ایک ڈھیر میرے پاس جمع تھا۔ اس نے اکبر کے بچوں کو کچھ روپے تھمائے تھے اور پھر میرا ہاتھ تھام کر وہ اپنی جیپ کے پاس لے آیا تھا، کچھ عورتیں اور بچے باہر گلی میں نکل آئے تھے۔ وہ انھیں نظر انداز کرتا ہوا میرا ہاتھ تھامے مجھے گاڑی میں بٹھانے لگا۔

اکبر کھڑکی کے پاس آیا تھا میں نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا، وہ سعادت مندی سے پیچھے ہٹ گیا تھا حدید نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور کچھ ہی دیر میں ہم اس گاؤں سے نکل کر مین روڈ پر آ گئے تھے۔ میں نے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں تمام راستے

حدید نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، وہ بس خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا راستے میں ایک دو بار رک کر اس نے مجھے چائے اور کھانا کھلایا تھا اور پھر اسی طرح خاموشی سے گاڑی چلا دی۔

رات کا پچھلا پہلا تھا جب ہم ایبٹ آباد اس کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے تھے، وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے آیا تھا، اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اس کے ساتھ میری ایک تصویر رکھی تھی، مجھے بیڈ پر بٹھا کر وہ ڈریسنگ روم میں یونیفارم بدلنے چلا گیا تھا، واپس آ کر بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی بس میری گود میں سر رکھ کر بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں اس کے چہرے کو دیکھنے لگی میری مار کے سارے نشان وہاں واضح تھے میں اس کے بالوں اور چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی اس نے کوئی حرکت نہیں کی وہ سو چکا تھا پتا نہیں کب سے نہیں سویا تھا، میں اس کا سر سہلاتی رہی جیسے بچپن میں سہلاتی تھی۔



''آپ کو نہیں پتا، میں آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا ہوں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میں نے آپ کا پتا نہ کروایا ہو کوئی رشتہ دار ایسا نہیں جہاں میں نہ گیا ہوں اور جس جس رشتہ دار کے پاس جاتا رہا اس سے آپ، ایمن اور سعد کے بارے میں وہ سب کچھ پتہ چلتا رہا جو مجھے معلوم نہیں تھا جو آپ نے چھپایا اسے لوگوں نے عیاں کر دیا۔

مجھے اس عورت پر افسوس ہوا جس نے مجھے پیدا کیا تھا اور اس آدمی پر بھی جو میرا باپ کہلاتا ہے اور آپ پر بھی اس دور میں اتنا ایثار اتنی قربانی کس کے لیے، کیوں کیا، آپ انسان نہیں ہیں کیا آپ کے جذبات نہیں ہیں۔

ممی میں نے ٹھیک کہا تھا آپ بہت احمق ہیں، جو اپنے حق کے لیے خود نہیں لڑ سکتا کوئی دوسرا اس کے لیے کیسے لڑے گا اور آپ کو تو اپنی چیز اپنے پاس رکھنی بھی نہیں آتی آپ تو اپنی چیز کی حفاظت تک نہیں کر سکتیں، آپ نے کیا سوچا تھا کہ میں ایبٹ آباد سے واپس جا کر آپ کی بہن اور آپ کے شوہر کے درمیان صلح کرواتا رہا تھا اس عورت کے لیے لڑ رہا تھا جس نے مجھے پیدا کیا تھا، نہیں میں تو آپ کے لیے لڑ رہا تھا میں تو اس سب کو ہونے سے روکنا چاہتا تھا جواب ہو گیا ہے۔

آپ جانتی ہیں آپ کے سابقہ شوہر کتنے ماہ سے آپ کی بہن کے ساتھ پھر رہے تھے وہ جو ہر ایک دو ہفتے کے بعد غائب ہو جاتے تھے وہ کوئی بزنس ٹرپ نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ دونوں سیر و تفریح کے لیے مری وغیرہ آیا کرتے تھے اور میں نے بھی انھیں وہیں دیکھا تھا اس عورت کا چہرہ بہت مانوس سا لگا لیکن میں فوراً اسے پہچان نہیں پایا اور پھر جب پہچانا تو مجھے ایک شاک لگا تھا کیونکہ آپ دونوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ مر چکی ہے اور اگر وہ مر گئی تھی تو اب زندہ کیسے ہو گئی تھی۔

میں اسی کے بارے میں پوچھنے کے لیے لاہور جاتا رہا، میں ان دونوں کے اصلی تعلقات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، ان دونوں میں طلاق کیوں ہوئی میں یہ جاننا چاہتا تھا اور آپ کو پتا ہے کہ آپ کی بہن اور آپ کے سابقہ شوہر دونوں نے مجھ سے اس طلاق کی اصل وجوہات کے بارے میں جھوٹ بولا، انھوں نے کہا کہ آپ نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں مگر مجھے یقین نہیں آیا پھر میں نے ان کے درمیان ہونے والی خلع کا ریکارڈ نکلوایا، تب مجھ پر بہت سے انکشافات ہوئے تھے۔

آپ کی بہن کا دوسرا شوہر چند سال پہلے مر گیا تھا۔ لہٰذا میں اس سے تو نہیں مل سکتا تھا ہاں میں نے اس کی فیملی میں اس کے بہن اور بھائیوں سے ملاقات ضرور کی سو جو کچھ ابہام رہ گئے تھے وہ بھی دور ہو گئے۔

مجھے آپ سے حقیقت چھپانے کا گلہ تھا، اس لیے کچھ دنوں تک میں آپ سے خفا بھی رہا مگر آپ نے ایک بار بھی مجھ سے وجہ نہیں پوچھی، آپ نہیں جانتیں میں آپ کے شوہر کو آپ کی بہن سے ملنے سے روکنے کے لیے کتنا لڑتا رہا ہوں، میں جانتا تھا کہ اگر وہ اسی طرح ملتے رہے تو پھر وہ آپس میں شادی کر لیں گے اور آپ کو طلاق دیے بغیر یہ نہیں ہو سکے گا۔

اگر وہ کوئی دوسری عورت ہوتی آپ کی بہن ہوتی تو میں یہ طلاق ہونے نہیں دیتا میں آپ کو اپنے پاس لے آتا اور اس شخص کو کہتا کہ وہ آپ کو طلاق نہ دے چاہے تو دوسری شادی کر لے مگر یہاں معاملہ الٹ تھا میں اس شادی کو روکنے کے لیے آپ کی بہن کے پاس بھی گیا تھا اور نہ

چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کی منتیں کی تھیں کہ وہ اس شادی کا خیال دل سے نکال دے جو چیز جیسے ہے اسے رہنے دے میں نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ یہ شادی نہ کرے تو میں اس سے دوبارہ ملنا شروع کر دوں گا بلکہ اگر وہ چاہے گی تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں گا بس وہ آپ کو اپنے شوہر کے پاس رہنے دے۔

میں جانتا تھا کہ بہت عرصے کے بعد آپ کے تعلقات اپنے شوہر کے ساتھ ٹھیک ہوئے تھے اور آپ ان کے ساتھ بہت خوش تھیں اور میں آپ کی اس خوشی کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ اس شادی کا خیال دل سے نہیں نکالتی تو پھر یہ سوچ لے کہ وہ شوہر کو تو پالے گی مگر بیٹے کو کھو دے گی میں دوبارہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گا مگر اس نے کہا تھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں جو اپنی ماں کا خیال کرنے کی بجائے ایک غیر عورت کے لیے اپنی ماں کا گھر آباد ہونے نہیں دے رہا۔

اس نے کہا تھا اس کی شادی کے بعد ہمارا ٹوٹا ہوا گھر پھر سے مکمل ہو جائے گا، مجھے میری ماں مل جائے گی اور اسے اس کا شوہر لیکن میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے اس گھر کے مکمل ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے میں ہر چیز پہلے کی طرح رکھنا چاہتا ہوں، میں نے آپ کے شوہر سے بھی بہت دفعہ کہا تھا کہ وہ آپ کو طلاق نہ دے میں نے اسے کہا تھا کہ میں لوگوں کو کیا بتاؤں گا، کیا کہوں گا کہ اس نے اس عمر میں میری ماں کو طلاق کیوں دے دی ہے۔ کیا خرابی نظر آئی ہے اسے، مگر وہ بھی بار بار مجھے یہی کہتا رہا تھا کہ تمھیں اپنی اصلی ماں کا خیال نہیں ہے جو ساری عمر تمھارے لیے تڑپتی رہی ہے تمھیں بار بار اس کا خیال آ رہا ہے جس کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

آپ نہیں جانتیں ممی میں ان دونوں کے سامنے کس طرح گڑگڑاتا رہا تھا منتیں کرتا رہا تھا زندگی میں کبھی مجھے کسی کے سامنے اس طرح گھٹنے ٹیکنے نہیں پڑے تھے مگر وہ دونوں اپنی ضد پر قائم تھے دونوں کا اصرار تھا کہ یہ سب وہ میرے لیے کر رہے ہیں اور میں سوچتا تھا کہ اگر انھیں میرا اتنا خیال ہے میری خوشی ان کے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہے تو یہ میری بات کیوں نہیں مان لیتے اور میں سوچتا تھا کہ ان دونوں کی خود غرضی نے آپ کو کس طرح سولی چڑھایا ہو گا آپ نے کس طرح وہ سب برداشت کیا تھا کیسے آپ نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے ہوں گے اور سانس لیتی ہوں گی۔

وہ دونوں انسان نہیں ہیں وہ جانور بھی نہیں ہیں کیونکہ جانور اتنے خود غرض اور منافق نہیں ہوتے جتنے وہ ہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ دونوں اپنی ضد سے باز آ جائیں گے شاید انھیں آپ کا نہیں تو میرا ہی لحاظ آڑے آ جائے گا مگر ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا میں جب لاہور گیا تھا اور میں نے ایمن کو اپنے گھر میں دیکھا تھا تو میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی، وہ دونوں مجھے دیکھ کر یوں مسکرا رہے تھے جیسے انھوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو اور میرا دل چاہ رہا تھا میں دونوں کو شوٹ کر دوں۔

آپ نے سوچا کہ میں نے ان دونوں کی شادی کروائی ہے آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے، میں کیا اتنا ذلیل اور بے غیرت ہو سکتا ہوں، آپ کے لیے میں نے اخباروں میں اشتہار چھپوائے تھے آپ نہیں جانتیں میں نے کتنی دعائیں کی تھیں اللہ تعالیٰ سے، میں ان پندرہ دنوں میں ایک دن بھی ٹھیک سے نہیں سویا اور جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے ہر چیز سے میرا جی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا پھر ایک دن اکبر کا فون آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس تصویر سے ملتی جلتی ایک عورت اس کے پاس ہے مگر وہ اپنے بارے میں کچھ اور ہی کہتی ہے میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا اور جب میں نے آپ

کو وہاں زمین پر لیٹے دیکھا تو آپ نہیں جان سکتیں میری کیا حالت ہوئی تھی اور آپ نے تو حد کر دی مجھے اس طرح مارا کہ ابھی تک درد ہو رہا ہے کیا مائیں ایسا کرتی ہیں؟''

اگلی دوپہر وہ کھانے کی میز پر بیٹھا ساری رام کہانی سنا کر شکوہ کر رہا تھا، میں شرمندہ تھی کیا کہتی کیا جواب دیتی۔

✡......✪......✡

پھر دن گزرنے لگے تھے میں طلاق کا زخم بھولنے لگی تھی، حدید نے مجھے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا تھا جو ایک کالج میں لیکچرار تھی، ایک بہت ہی باحیثیت فیملی سے تعلق رکھتی تھی، فاریہ مجھے بھی پسند آئی تھی اور میں نے حدید کے ساتھ اس کی شادی طے کر دی تھی، حدید نے فاریہ کے گھر والوں کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا، چونکہ فاریہ بھی اسے پسند کرتی تھی اس لیے اس کے گھر والوں نے سعد سے ملنے پر اصرار نہیں کیا۔

حدید نے فاریہ کو شادی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد جاب نہیں کرے گی اور فاریہ نے بغیر کسی اعتراض کے یہ شرط قبول کی تھی وہ ایک بہت ہی تابعدار قسم کی بیوی ثابت ہوئی تھی حدید سے کافی ڈرتی تھی اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتی تھی حالانکہ اس کے میکے والے بہت امیر تھے مگر پھر بھی وہ ہمیشہ حدید کے کہنے پر چلتی تھی، حدید کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اسامہ، ولید اور کومل وقت بڑے سکون اور امن سے گزر رہا تھا سعد نے ایک دو بار حدید سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر حدید نے بہت بری طرح اسے رابطہ قائم کرنے سے منع کر دیا تھا۔

''آپ نہیں جانتیں ممی یہ شخص کتنا خود غرض ہے میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آپ کو طلاق دے کر اس عورت سے شادی کرے گا تو مجھے کھو دے گا تب اس نے پروا نہیں کی اب اسے اپنے کیے کا بدلہ وصول کرنا ہی پڑے گا، آپ مجھے مت کہیں کہ میں اس شخص سے ملنا شروع کر دوں۔''

اس نے ایک دفعہ میرے اعتراض پر کہا تھا۔

''میں اس شخص کا بیٹا ہوں اسی لیے چھوٹے دل کا ہوں، آپ کا بیٹا ہوتا تو شاید بڑے دل کا ہوتا پھر سب کچھ آپ کی طرح بھول جاتا مگر اب نہیں بھول سکتا نہ ہی انھیں معاف کر سکتا ہوں۔''

میں چپ ہو گئی تھی اور یہی بہتر تھا مگر میں بہت خوش ہوئی تھی اس بات سے کہ اب حدید سعد کے پاس نہیں جائے گا نہ ہی ایمن کے پاس۔

ساری زندگی ان دونوں کے لیے ایثار کرتے کرتے میں تھک گئی تھی اب اور ایثار نہیں کر سکتی تھی، کیا ملتا ہے اس ایثار سے اپنی ہر چیز دوسروں کو دے کر کیا حاصل ہوتا ہے کچھ بھی تو نہیں، میرے جیسے خالی دامن لوگ خالی دل بھی ہو جاتے ہیں، ہر ایک کو تو حدید نہیں ملتا نا، تو پھر ایک بار مجھے وہ مل گیا ہے تو میں اسے واپس کیوں لوٹاؤں۔

پھر اس دن ایمن نے فون کیا تھا۔

''کیسی ہو مریم؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں تم بتاؤ کیوں فون کیا ہے۔'' میں نے وقت ضائع کیے بغیر پوچھا تھا، چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا تھا۔

''میں حدید سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''مگر وہ تم سے بات کرنا نہیں چاہتا یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

''وہ میرا بیٹا ہے اس طرح کی باتیں کہہ دینے سے خونی رشتے نہیں ٹوٹتے۔'' اس کی ڈھٹائی پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔

''تمھیں حدید کی اب کیا ضرورت آن پڑی ہے۔ سب کچھ تو ہے تمھارے پاس دو شوہروں کی دولت، دو بیٹیاں، سعد جیسا شوہر پھر حدید کی کیا ضرورت ہے تمھیں۔''

میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا تھا وہ چند لمحے چپ رہی تھی پھر اس نے کہا تھا۔

''وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، ایک نہ ایک دن تو وہ میرے پاس ہی آئے گا۔''

میں نے فون بند کر دیا تھا۔

''نہیں ایمن اب وہ تمھارے پاس نہیں آئے گا، کبھی بھی نہیں آئے گا میں اسے جانے دوں گی تب نا۔'' میں نے سوچا تھا۔

پھر اس نے ایک بار نہیں بار بار فون کیا تھا، بہت آہستہ آہستہ سہی مگر اس کے لہجے کا سارا طنطنہ رخصت ہو چکا تھا، وہ اپنی دونوں بیٹیاں بیاہ چکی تھی اور دونوں ہی بیرون ملک تھیں وہ دونوں اب تنہا تھے اسی لیے انھیں حدید کی یاد آتی تھی۔

ایمن نے ایک بار سعد کے ذریعے بھی مجھ سے یہی مطالبہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں حدید کو اور اس کے بیوی بچوں کو ان سے ملنے کے لیے مجبور کروں، میں چپ چاپ سعد کی آواز سن رہی تھی وہ اسی طرح حکمیہ لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے وہ کرتا تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کب حدید آ گیا تھا اس نے فون کا ریسیور مجھ سے لے لیا تھا اور سعد کی آواز سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا، اس کے جو دل میں آیا تھا اس نے سعد کو کہہ ڈالا تھا اور پھر ریسیور پٹخ دیا تھا۔

''ممی یہ شخص میرے اور آپ کے لیے مر چکا ہے پھر آپ اس کے فرمان کیوں سنتی ہیں آج کے بعد آپ اس شخص کا فون کبھی اٹینڈ نہیں کریں گی اور میں یہ بات دوبارہ نہیں کہوں گا۔''

یہ پہلا اور آخری حکم تھا جو آج تک حدید نے مجھے دیا تھا اور میں نے اس پر عمل کیا تھا۔

✡......✪......✡

''آپ ابھی تک سوئی نہیں ہیں۔'' حدید اندر آ گیا تھا میں مسکرائی تھی۔

''تمھارے بیٹے کی فرمائشیں ختم ہوں تب سوؤں نا۔''

''یہ بھی نہیں سویا ابھی تک، کیوں اسامہ آپ اب تک کیوں جاگ رہے ہیں سوئے کیوں نہیں۔'' اس نے گھرکنے کے انداز میں اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

''بس پاپا سونے والا ہی تھا۔'' اسامہ نے باریک سی آواز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں، حدید کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا، اپنی کیپ اور چھڑی اس نے میرے بیڈ پر اچھال دی پھر شوز کے تسمے کھولنے لگا۔

''تھک گئے ہو چائے بنا دوں۔'' میں جانتی تھی وہ اس وقت کسی ریڈ سے آیا ہو گا۔ اس نے کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں ملازم کو کہہ آیا ہوں، وہ چائے لا رہا ہو گا۔''

''اسامہ آپ ذرا سا آگے ہو جائیں۔'' ایک دم وہ اٹھ کر بیڈ پر آ گیا اور اس نے اسامہ کو دھکیل کر آگے کر دیا۔

''اتنی محنت کرتی ہے پولیس پھر بھی پولیس کو برا بھلا کہا جاتا ہے راتوں کو جاگیں دن کو بھاگیں پھر بھی ہر کوئی پولیس میں کیڑے نکالتا ہے۔''

وہ آنکھیں بند کیے مجھ سے مخاطب تھا، پھر اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''آپ Dentist کے پاس گئی تھیں۔'' اچانک اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں فاریہ کے ساتھ گئی تھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تھا اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''آپ کا کیا خیال ہے، اب کومل کو اسکول داخل کروا دینا چاہیے؟'' وہ پھر آنکھیں بند کیے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں بھئی ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔''

''مگر باتیں تو بہت کرتی ہے۔''

''باتوں کا کیا ہے وہ تو تم بھی بہت کرتے تھے، وہ بھی تمہاری طرح ہے۔'' وہ میری بات پر بہت دلکشی سے ہنسا تھا مگر آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

''ٹائم کیا ہوا ہے ممی؟''

''تین بجنے والے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا تھا۔

''اب میں چائے نہیں پیوں گا بس یہیں سو جاؤں گا، آپ لائٹ آف کر دیں اور صبح مجھے مت اٹھائیے گا، میں لیٹ اٹھوں گا، کل لنچ آپ بنائیے گا فاریہ یا ملازم سے مت بنوائیے گا۔ گڈ نائٹ ممی۔''

اس نے آنکھیں بند کیے ہی اپنا طویل پروگرام مجھے بتا دیا، میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تھا۔

''گڈ نائٹ۔'' لائٹ آف کرنے سے پہلے ایک بار میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ سو چکا تھا میں نے چادر اس کے اوپر پھیلا دی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اور آج وہ کہہ رہی تھی کہ میں حدید سے کہوں کہ وہ اسے معاف کر دے اور آج وہ رو رہی تھی اور اب اسے حدید یاد آتا تھا وہ کہا کرتی تھی، میں چیزوں کو نہیں کھینچتی وہ خود میرے پاس آتی ہیں مجھ میں اتنی طاقت ہے اور اگر کوئی انھیں جانے سے روکنا چاہے تو روک کر دیکھ لے۔

''نہیں ایمن چیزیں تمہارے پاس اس لیے چلی جایا کرتی تھیں کیونکہ لوگ انھیں روکا نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ تم سے محبت کرتے تھے مگر یہ سب کب تک ہوتا، ایک دن تو تمہارا جادو ختم ہونا ہی تھا اور وہ دن آ چکا ہے اب تم کس کس چیز کو بلایا کرو گی، کون سا حربہ استعمال کرو گی، کون سا اسم پڑھو گی، پچھلے پچیس سال ہر چیز کے ہوتے ہوئے میں نے تنہا گزارے تھے، اگلے پچیس سال تم اور سعد تنہا گزارو گے اگر زندہ رہ پائے تو، یہی مکافات عمل ہے۔''



کس جہاں کا زر لیا

آپ نے کبھی سوچا ہے دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جنھیں ہم روپے سے خرید نہیں سکتے۔ جنھیں دعائیں بھی ہمارے پاس نہیں لا سکتیں اور آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ بعض دفعہ وہ چیزیں ہی ہماری پوری دنیا ہوتی ہیں۔ دل کی دنیا تو کیا زمین پر انسان دل کی دنیا کے بغیر رہ سکتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں پچھلے تیس سال سے اس دنیا میں رہ کر دل کی دنیا کے بغیر اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ بعض دفعہ تعارف کی ضرورت بھی تو نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ شاید کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس دل چاہتا ہے دنیا میں ''غارِ حرا'' جیسی خاموشی ہو اور ہم اپنے ''اندر'' کو باہر لے آئیں۔

میں جانتا ہوں آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میری زندگی میں کوئی کمی ہے، کوئی چیز ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ میری کوئی تمنا ہے جو پوری نہیں ہوئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سوچ رہے ہوں کہ میں محبت میں ناکامی کا شکار ہوا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے، ہر وہ چیز جس کی آپ تمنا کر سکتے ہیں۔ جسمانی خوبصورتی، ایک عدد ڈگری، آٹھ دس بڑی بڑی فیکٹریز، ہر ملکی اور غیر ملکی بنک میں لمبا چوڑا بنک بیلنس، تین جوان، خوبصورت، تعلیم یافتہ اور فرمانبردار بیٹے اور چار پانچ شاندار گھر، محبت میں بھی کسی ناکامی سے دوچار نہیں ہوا۔

میں نے جس سے محبت کی اسی سے شادی کی۔ شادی کے تیس سال بعد بھی میری بیوی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے جس طرح پہلے کرتی تھی۔ آج بھی میری ہر بات اس کے لیے فرمان کا درجہ رکھتی ہے۔ آج بھی اسے میرے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا پھر بھی پتا نہیں میں خوش کیوں نہیں ہوں۔ عجیب بات ہے نا مگر میرے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اب شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کسی بیماری کا شکار ہوں یا پھر یہ سب کسی ڈپریشن کے زیر اثر لکھ رہا ہوں۔

آپ اب بھی غلطی پر ہیں، میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح سے تندرست ہوں۔ کم از کم ہر ماہ ملک کے سب سے بہترین ہاسپٹل میں ہونے والا میرا چیک اپ تو یہی بتاتا ہے۔ میں ہفتے میں تین بار گالف کھیلتا ہوں۔ دو بار سوئمنگ کے لیے جاتا ہوں۔ شام کو گھر کے قریبی پارک میں ایک گھنٹہ کی واک بھی ضرور کرتا ہوں۔ کسی بھی شخص کو ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست رکھنے کے لیے کیا اتنا کافی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے اب آپ مجھے قنوطی یا تارک الدنیا قسم کا شخص سمجھ رہے ہوں گے۔ کوئی Introvert ٹائپ۔ ایسا بھی نہیں۔ میری ہر شام کسی نہ کسی فنکشن میں ہی گزرتی ہے۔ کبھی وہ گھر پر ہوتا ہے، کبھی کلب میں اور کبھی اپنی کمیونٹی کے کسی دوسرے شخص کے ہاں۔ میں اس لحاظ سے بھی بہت سوشل ہوں۔ ایک اچھی اور پرسکون زندگی گزارنے کے لیے جتنے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس ہیں پھر بھی پتا نہیں میں خوش کیوں نہیں ہوں۔ ایک منٹ اب میں آپ سے کچھ غلط بیانی کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے میں خوش کیوں نہیں ہوں مگر تیس سال بعد کسی کو اپنی ناخوشی کی وجہ بتانا کچھ عجیب نہیں ہے کم از کم مجھے تو بہت عجیب لگ

رہا ہے۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ پچھلے تیس سال میں ہر روز چند گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جب مجھے اپنا وجود کسی ٹھنڈی قبر میں اترا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جیتے جی قبر میں اترنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور پھر ہر روز۔ مگر بہت سی چیزیں آپ کے اختیار میں نہیں ہوتیں، آپ چاہیں بھی تو۔

خیر چھوڑیں اس تذکرے کو۔ میں دوبارہ قبر میں اترنا نہیں چاہتا۔

میں جانتا ہوں اس وقت آپ میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو مجھے ناشکرا سمجھ رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے آپ کی تشخیص ٹھیک ہو شاید مجھے یہی بیماری لاحق ہے اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں تو ٹھیک سمجھ رہے ہیں، مگر میں ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا کہ کیا میں واقعی کسی پچھتاوے کا شکار ہوں۔ نہیں، نہیں آپ غلطی پر ہیں اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں کوئی متقی آدمی ہوں جس کی زندگی میں کوئی غلط کام ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی پچھتاوا۔ میرے شش و پنج کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پچھتاوا تو باضمیر لوگوں کو ہوتا ہے۔ کیا میں اتنا باضمیر ہوں کہ مجھے پچھتاوا ہونے لگا ہے۔ اور کیا پچھتاوا کسی چیز کی تلافی کر سکتا ہے۔ آپ تلافی کے لفظ کو ایک بار پھر پڑھیے میں ''تلافی'' کی بات کر رہا ہوں۔ ''تلافی'' کی۔

میرا دل چاہتا ہے میں ایک بار ملیحہ سے یہ سوال پوچھوں۔ کیا کوئی چیز اس کے نقصان کی تلافی کر سکتی ہے؟

کیا کوئی چیز اس کے زیاں کا مداوا کر سکتی ہے؟

کیا کوئی چیز اس کے زخموں کے لیے مرہم بن سکتی ہے؟

کیا میرا کوئی عمل ببول کے ان کانٹوں سے اس کے وجود کو نجات دلا سکتا ہے جو میری وجہ سے اسے گرفت میں لیے ہوئے ہیں؟

میں جانتا ہوں آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اگر ملیحہ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں تو کرتا کیوں نہیں۔ مجھے کس چیز نے روک رکھا ہے؟

سوال کرنے کے لیے اس شخص کا سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ سامنے ہوئے بغیر بھی کسی دوسرے شخص کے ذریعے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے، مگر پھر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس دوسرے شخص کو اس بندے کا پتا ہو جس سے آپ سوال کر رہے ہیں۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ رابطے کی ایک صورت تحریری بھی تو ہوتی ہے۔ میں خط کے ذریعے بھی تو سوال کر سکتا ہوں۔ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں مگر خط لکھنے کے لیے بھی تو اس شخص کا پتا چاہیے ہوتا ہے اور میرے پاس ملیحہ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا...... میں ہمیشہ اس لفظ کی جگہ خالی رکھتا ہوں۔ اس طرح مجھے چند لمحے سانس لینے میں آسانی رہتی ہے۔

میں جانتا ہوں اب آپ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں کہ ملیحہ کون ہے؟ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ مجھ سے کون سی غلطی ہوئی ہے؟ مجھے کس بات کا پچھتاوا ہے؟ میں اس کے اتے پتے سے لاعلم کیوں ہوں؟

میرے پاس ان میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہیں ہے۔ وہ کون تھی؟ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا؟ مجھ سے کیا غلطی ہوئی تھی؟ مجھے کس بات کا پچھتاوا ہے؟ میں پچھلے تیس سال سے ان ہی سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تیس سال گزرنے کے باوجود میرے پاس ایک بھی سوال کا جواب نہیں ہے۔

✡......✪......✡

بعض لوگ دوسروں کی زندگی میں غلط مواقع پر آتے ہیں۔ جیسے ملیحہ میری زندگی میں غلط موقع پر آئی تھی۔ بعض لوگ ساری عمر صحیح چیزیں چنتے چنتے بس ایک بار غلط چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ غلطی ان کی باقی ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے جیسے ملیحہ نے کبھی میرا انتخاب کیا تھا۔ لوگ اکثر کہتے ہیں خودغرض لوگوں کی خودغرضی ان کے چہرے پر عیاں رہتی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ملیحہ کو تیس سال پہلے میرے چہرے پر یہ خودغرضی نظر کیوں نہیں آئی۔ میرا انتخاب کرنے سے پہلے اسے میرا چہرہ پڑھنا چاہیے تھا۔ غور کرنا چاہیے تھا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے کس چیز کا انتخاب کر رہی ہے۔ پتا نہیں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا اور مجھے تیس سال سے یہی چیز پریشان کر رہی ہے کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔

میں جانتا ہوں اب تک آپ کے ذہنوں کے اندر سوالوں کا جوار بھاٹا اٹھ رہا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، کم از کم وہ سب کچھ جس کا تعلق میری ذات سے ہے۔



میں نے اپنا بچپن بہت غربت میں گزارا تھا۔ دو بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ میرے والد ایک فیکٹری میں سپروائزر تھے۔ انھوں نے ہمیشہ حلال کی کھانے اور کھلانے کی کوشش کی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ایسی صورت میں ہوتا ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں کی فرسٹریشن میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ہمارے گھر کی اندرونی اور بیرونی حالت ہر ایک سے چلا چلا کر کہتی تھی کہ وہ رزق حلال کا نتیجہ ہے اور یہ حالت بہت سے لوگوں کو بہت کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی۔ گھر میں سب سے بڑا میں تھا اس لیے مجھ پر ذمہ داریاں بھی سب سے زیادہ تھیں۔

بچپن سے ہی مجھے بہت سے ایسے چھوٹے موٹے کام کرنے پڑے جس سے گھر کے اخراجات پورے کرنے میں مدد ملتی۔ چوڑیوں اور مہندی کے سٹالز لگانے سے لے کر ٹیوشنز پڑھانے تک، یونیورسٹی پہنچنے تک میں نے ہر کام کیا۔ محنت کی عظمت کا تو خیر کیا اندازہ ہوتا، مجھے دولت کی عظمت کا اندازہ بخوبی ہوگیا۔ میں اکنامکس کا سٹوڈنٹ تھا۔ مجھ سے زیادہ اچھی طرح سے معاشیات کے اصولوں سے کون واقف ہو سکتا تھا۔

میں ان دنوں ہر Calculation اپنے لیے کیا کرتا تھا۔ کون سی چیز میرے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے، کون سی نقصان دہ۔ کون سی چیز اچھی ہوگی، کون سی بری۔ کون سی چیز ضروری ہے، کون سی ثانوی۔ میں ان دنوں زندگی کے لیے اپنے فارمولے نکالنے میں مصروف تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں مکمل طور پر مادہ پرست ہو چکا تھا۔ نہیں، میرا خیال ہے مکمل طور پر نہیں لیکن بڑی حد تک۔ اصل میں یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے میں اگر اپنے لیے زندگی کا لائحہ عمل طے کر چکا تھا تو دوسری طرف شہلا کی محبت میں بھی بری طرح گرفتار ہو چکا تھا اور جو لوگ اس مادہ پرست دنیا میں بھی محبت کرتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر تو کبھی بھی میٹریلزم کا شکار نہیں ہو سکتے۔ میں جانتا ہوں آپ کو میرے لفظوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہوگا لیکن یہ سچ ہے۔ میں نے زندگی میں شہلا سے بڑھ کر کسی کو نہیں چاہا حتیٰ کہ دولت کو بھی نہیں۔ عجیب بات ہے نا پہلے لوگ محبت میں تقابل کرنے کے لیے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی ماں سے بڑھ کر کسی کو نہیں چاہا یا گھر والوں سے بڑھ کر یا اولاد سے بڑھ کر اور میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے شہلا کو دولت سے بھی بڑھ کر چاہا ہے، کیونکہ اس وقت میرے پاس دولت نہیں تھی اور نہ ہی دور دور تک اس کے حاصل ہونے کا امکان تھا پھر یک دم ہی دولت بھی نظر آنے لگی اور اسے حاصل ہونے کا امکان بھی۔

عجیب بات ہے میں نے آپ کو شہلا کے بارے میں تو بتا دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟ محبت کے علاوہ میرا اس سے کیا رشتہ ہے؟ اور ہم دونوں کو آپس میں محبت ہوئی کیسے؟

شہلا میری خالہ کی بیٹی تھی۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا بچپن سے ہی ہم دونوں گھروں کا آپس میں بہت میل ملاپ تھا بلکہ شاید حد سے زیادہ۔ وجہ رشتہ داری سے زیادہ غربت تھی۔ ظاہر ہے جب گھر میں چیزیں کم ہوں تو ان کے حصول کے لیے کہیں نہ کہیں تو جانا ہی پڑتا ہے۔ میری طرح وہ بھی تین بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ بچپن میں ہی اس کے ساتھ میری نسبت ٹھہرا دی گئی تھی۔ مجھے بچپن سے جوانی تک اس پر کوئی اعتراض اس لیے نہ ہوا کیونکہ وہ بے حد خوبصورت تھی کم از کم یہ وہ چیز تھی جس کے معاملے میں ہم دونوں گھرانوں کو کوئی غریب نہیں کہہ سکتا تھا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے ہم سارے بہن بھائی بھی شہلا اور اس کے بہن بھائیوں کی طرح لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک تھے۔ مگر بہر حال شہلا کی بات کچھ اور ہی تھی۔ اسے جیسے خدا نے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس کی خوبصورتی کو کیسے تحریر کروں کیونکہ لفظ کبھی بھی اس حسن کو بیان نہیں کر پائیں گے۔ جو کبھی شہلا کی ملکیت تھا بس آپ سمجھ لیں کہ میں ہمیشہ آگے بڑھنے کے تمام منصوبے اسے ساتھ رکھتے ہوئے بناتا تھا۔ میرا میٹریلزم کبھی بھی اس کے اور میرے درمیان دیوار نہیں بنا تھا۔ عجیب بات ہے نا مگر بہر حال یہ سچ ہے ہم دونوں اکثر اپنے منصوبے ڈسکس کیا کرتے تھے۔ شادی کے بعد کے خیالی پلاؤ پکایا کرتے تھے، وہ اپنی خواہشات بتایا کرتی تھی۔ میں اپنے خواب سنایا کرتا تھا، دونوں کی منزل ایک جیسے راستوں سے گزر کر آیا کرتی تھی۔ کہیں پر کوئی Clash نہیں تھا دونوں کے خواب دولت سے گندھے، مہکے اور بنے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمیں ایک دوسرے کی باتوں سے کبھی کوفت اور بیزاری نہیں ہوتی تھی۔

شہلا کہتی تھی اور اب بھی یہی کہتی ہے کہ اسے مجھ سے عشق تھا اور ہے۔ میرے بغیر وہ ایک دیمک زدہ لکڑی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جسے پانی کسی کا سہارا بننے دیتا ہے نہ اپنا، میرے لیے وہ میری زندگی تھی جس کے بغیر میں خواب دیکھ سکتا تھا نہ خواہش کرنے کے قابل تھا۔ ہم دونوں جب اکٹھے ہوتے تو کبھی بھی "ہم" کے علاوہ ایک دوسرے کے لیے کوئی دوسرا صیغہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا شعوری طور پر ہوتا لیکن زیادہ تر غیر شعوری طور پر۔

میں جانتا ہوں اب آپ میری ان سب باتوں سے اکتا گئے ہوں گے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے یہ کیا الف لیلیٰ سنانی شروع کر دی ہے محبت کے بارے میں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم صرف اپنی محبت کے بارے میں بات کرنا، پڑھنا اور سننا چاہتے ہیں کسی دوسرے کی محبت کے بارے میں نہیں۔ ہوسکتا ہے اس وقت آپ بھی اسی کیفیت کا شکار ہو رہے ہوں، بہر حال ٹھیک ہے میں شہلا کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں، میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اچانک مجھے دولت نظر آنی شروع ہو گئی تھی اور اس کے ملنے کے امکان بھی اور یہ سب کیسے ہوا تھا۔ ملیحہ علی کی وجہ سے۔

یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھنے والی بہت سی لڑکیوں میں سے ایک وہ بھی تھی۔ ایک بہت ہی امیر کبیر گھرانے کی واحد چشم و چراغ اس کی ماں کسی زمانے میں مشہور ماڈل رہی تھی۔ مگر علی احمد سے شادی کے بعد اس نے ماڈلنگ چھوڑ دی۔ شادی کے پانچ سال بعد ایک حادثے میں ان کا

انتقال ہو گیا تھا۔ ملیحہ اس وقت صرف دو سال کی تھی۔ علی احمد نے اس کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ انھوں نے اسے اکیلے ہی پالا تھا۔ وہ گریجویشن کر رہی تھی جب ان کا بھی اچانک انتقال ہو گیا تھا، اس کے کوئی قریبی عزیز نہیں تھے جو بھی عزیز تھے وہ دور کے تھے۔ علی احمد یہ عقلمندی کر گئے تھے کہ اپنی زندگی میں ہی اپنے لیگل ایڈوائزر کو اس کا گارجین بنا گئے تھے۔ وہ علی احمد کے انتقال کے بعد ان ہی کے گھر چلی گئی تھی۔ جب تک اس کی شادی نہ ہو جاتی اسے ان ہی کے ساتھ رہنا تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنھیں ہر لحاظ سے پسند کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں ہر ایک کی رائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس میں اگر کچھ ہاتھ اس کی دولت اور خوبصورتی کا تھا تو باقی ہاتھ اس کی ذہانت اور مینرز کا بھی تھا۔ وہ ہر لحاظ سے بہت نمایاں تھی اسے بات کرنا بھی آتا تھا اور بات منوانا بھی۔ اس کے ہر انداز سے اظہار ہوتا تھا کہ اسے بہت چاہا گیا ہے، اس کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے الگ گروپ میں رہتی تھی۔ اس کے خاص دوست تھے جن کی تعداد ہمیشہ محدود ہی رہتی تھی۔ کلاس کے دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی اس کی بہت سی باتوں نے متاثر کیا تھا۔ مگر بس صرف متاثر ہی کیا تھا میں اس کا گرویدہ ہوا تھا نہ اس پر شیدا ہوا تھا، ان دنوں میری آنکھوں میں شہلا نام کا بت نصب تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے دوسرا کوئی نظر کہاں آ سکتا تھا۔ ہاں اگر شہلا سے محبت نہ ہو چکی ہوتی تو پھر یقیناً میں بھی کلاس کے بہت سے دوسرے لڑکوں کی طرح ملیحہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا یک طرفہ محبت، کیونکہ وہ کبھی کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔

اپنی مڈل کلاس کے دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی اس زمانے میں بڑے کمپلیکسز تھے اور انہی کمپلیکسز نے مجھے اس سے دور رہنے پر مجبور کیا تھا۔ اس سے کیا بلکہ کلاس اور یونیورسٹی کی ہر لڑکی سے۔ اس زمانے میں مجھے شہلا اور دولت کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ میں دلچسپی لینے کی کوشش بھی کرتا تو بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ کسی لڑکی کی طرف پیش قدمی کر پاتا رومانس کرنے کے لیے وقت اور روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میرے پاس ان دونوں ہی چیزوں کی کمی تھی اور لڑکیوں کو مائل کرنے کے لیے یہی ہتھیار ہوتے ہیں بہر حال......

مجھے نہیں پتا ملیحہ علی نے کب مجھ میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ شروع میں مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہوا۔ بعد میں یک دم یہ علم ہونے پر میں بہت محتاط ہو گیا کہ وہ میرے دوستوں سے میرے بارے میں معلومات لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اپنی ذات میں اس کی دلچسپی کا مقصد جاننے میں ناکام رہا تھا۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ بڑھتی گئی۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ دوست جہاں میری قسمت پر رشک کر رہے تھے وہاں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے وقت گزاری کے طور پر فلرٹ کر رہی ہے۔ اس کی کلاس کی لڑکیوں کی بہت سی دلچسپیوں میں یہ تفریح بھی شامل ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پہلو بچانے کی بے تحاشا کوشش کی، اسے نظر انداز کرنے کے لیے بھی بہت سے جتن کرتا رہا۔ مگر یہ سب بہت دیر تک ممکن نہیں رہا آہستہ آہستہ میں نے سرینڈر کرتے ہوئے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔

میں مانتا ہوں اس دوستی میں اس کی خوبصورتی اور اچھے رویے سے زیادہ اس کی دولت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کون تھا جو ایک امیر و کبیر لڑکی کی قربت نہیں چاہتا، جو نہیں چاہتا وہ صرف احمق ہی ہو سکتا ہے اور میں بہر حال احمق نہیں تھا۔ اس کی دوستی نے میرے بہت سے مسائل حل کرنے

شروع کر دیے تھے۔ جیسے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ، اس کا ڈرائیور مجھے گھر سے کچھ فاصلے پر اسٹاپ سے پک کیا کرتا تھا اور پھر وہیں چھوڑ جاتا تھا۔ وہ مجھے بے تحاشا تحفے دیا کرتی تھی اور یہ ایسے تحائف تھے جن کا میں نے بس خوابوں میں ہی تصور کیا تھا۔ اس کے ساتھ دوستی کے صرف چھ ماہ بعد میرے صندوق میں رکھے ہوئے تمام ملبوسات میں سے کوئی بھی میرا ذاتی خریدا ہوا نہیں تھا۔ یہی حال جوتوں کی اس لمبی قطار کا تھا جو میری چارپائی کے نیچے دھرے تھے، میرے گھر میں پرفیومز گھڑیوں گلاسز ٹائی پنز اور کف لنکس جیسی چیزوں کا بھی ایک انبار لگ گیا تھا۔ میں جانتا ہوں اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کے بدلے میں نے اسے کیا دیا آخر تحائف کے بدلے میں کچھ نہ کچھ تو دیا ہی جاتا ہے۔ میں نے بھی بہت دفعہ اسے چھوٹے موٹے تحائف دینے کی کوشش کی مگر ہر بار اس نے انکار کر دیا۔ وہ ہر بار ایک ہی جملہ کہتی۔

"تم سے تحفہ نہیں کچھ اور لینا ہے مگر ابھی نہیں کچھ عرصہ کے بعد۔"

میں ہر بار اس کے جملہ پر غور ہی کرتا رہ جاتا مگر کبھی بھی اس کے اصلی مفہوم کو نہ جان پایا۔ شہلا کو میں نے اس دوستی سے بے خبر رکھا تھا اپنے گھر والوں کی طرح جنھیں میں یہی کہا کرتا تھا کہ یہ سب تحائف مجھے میرے دوست دیتے ہیں۔

شروع کے چند بار کے سوا مجھے پھر کبھی لمبی چوڑی وضاحتوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ شہلا کو میں نے اس لیے ملیحہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خوامخواہ حسد کا شکار ہوگی، جبکہ میرے دل میں ملیحہ کے لیے کوئی خاص قسم کے جذبات نہ تھے۔ میں جانتا ہوں یہ جان کر آپ مجھے بہت کمینہ اور گھٹیا سمجھیں گے کہ ملیحہ سے میری دوستی صرف تحائف بٹورنے کے لیے تھی۔ آسائشیں کس کو اچھی نہیں لگتیں خاص طور پر اگر وہ پہلے کبھی نہ ملی ہوں تو پھر اگر میں ان ترغیبات کا شکار ہو گیا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ بہر حال میں نے بہت دیر تک ملیحہ کے وجود سے گھر والوں اور شہلا کو بے خبر رکھا اور شائد ہمیشہ ہی رکھتا اگر ملیحہ نے اس دن وہ سب نہ کہا ہوتا۔

اس دن یونیورسٹی سے واپسی پر وہ گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے راوی کے کنارے لے آئی تھی۔ بہت دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے موسم کی، یونیورسٹی کی، کلاس فیلوز کی، اسٹڈیز کی، گھر والوں کی، وہ بہت عجیب سے موڈ میں تھی۔ پتا نہیں اس دن اسے اپنے ماں باپ کی اتنی بہت سی باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ ماں کے بارے میں اس نے سب کچھ باپ سے سنا تھا مگر وہ اس کے بارے میں یوں بات کرتی جیسے یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا تھا میں خاموشی اور کسی قدر اکتاہٹ کے عالم میں اس کی باتیں سن رہا تھا جب اس نے اچانک کہا تھا۔

"پتا ہے فاروق مجھے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوگی میں چاہوں تو بھی نہیں مگر پھر بس میں نے تمھیں دیکھ لیا۔"

وہ چپ ہو گئی میں ہکا بکا تھا، اس نے پہلی بار مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ اور وہ بھی یوں کھلم کھلا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں کیا کہوں، اس نے ایک نظر میرے چہرے پر دوڑائی اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

"میں جانتی تھی تم یہ بات سن کر بہت حیران ہو گے مگر یہ سچ ہے مجھے تم سے واقعی محبت ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میں سارا دن گھر جانے کے بعد اس انتظار میں گزارتی ہوں کہ کب اگلی صبح آئے اور کب میں یونیورسٹی میں تم سے ملوں، میں یونیورسٹی صرف تمہارے لیے آتی ہوں جس دن تم وہاں آنا چھوڑ دو گے وہ میرا بھی یونیورسٹی میں آخری دن ہو گا۔"

میرے حواس تب تک بالکل معطل ہو چکے تھے میں جیسے سکتے کے عالم میں تھا اور وہ بولتی جارہی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

''فاروق احمد میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں، میں اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں، صرف تمہارے ساتھ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟''

اس نے پہلی بار بات کرتے ہوئے بڑی لجاجت سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں، اس وقت میرے سامنے صرف ایک ہی چہرہ تھا شہلا کا چہرہ اور وہ چہرہ میری ساری زندگی تھا۔

''ملیحہ! ابھی میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں نے اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں، میری شادی کا تو ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں۔'' میں نہیں جانتا اسے صاف صاف انکار کرنے کے بجائے میں نے اسے یہ سب کیوں کہا، میرے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی گرفت اور سخت ہو گئی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم پر ذمہ داریاں ہیں مگر میرے پاس بہت کچھ ہے اور وہ سب کچھ تمہارا ہے، تم جس طرح چاہو اسے استعمال کرنا، مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ مجھے تو صرف تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارا ساتھ چاہیے۔'' میں کچھ بول نہیں سکا، جانتا تھا اس کے پاس کیا کیا ہے اور مجھے اس ''کیا کیا'' کی بہت ضرورت تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی میرے ہاتھ پر تھا اور مجھے وہ ہاتھ سونے کا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اسے آس دلائی تھی نہ مایوس کیا تھا بس پھندا گلے میں ڈال کر اسٹول پر کھڑا کر دیا تھا۔

''فاروق! تمہیں یا تمہارے والدین کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں ان سب کو اپنا سمجھوں گا۔ ان سے بہت محبت کروں گی، تمہیں یا انہیں اپنے انتخاب پر کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔''

میں نے اسے پہلی بار ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

''میں جانتا ہوں دیکھوں گا کیا ہو سکتا ہے۔''

میں نے زندگی میں آج تک کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا، جتنا اس ایک جملے پر ملیحہ کو دیکھا تھا۔ ہم وہاں سے واپس آگئے۔

اس رات میں سویا نہیں۔ دولت آکر میرے کمرے کی دہلیز پر رک گئی تھی۔ مجھے اسے صرف اندر لے کر آنا تھا۔ اور اگر کوئی یہ سب کرنے سے روک رہا تھا تو وہ شہلا کا وجود تھا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، واقعی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر مجھے دولت کی بھی ضرورت تھی میں جیسے ایک دوراہے پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ملیحہ کے باپ کی ایک ٹیکسٹائل مل تھی۔ اس سے شادی کی صورت میں میں اس مل کا مالک ہوتا اور میرے ہاتھ جیسے الہ دین کا چراغ آجاتا میں اپنی بہنوں کی شادی کر سکتا تھا۔ اپنے بھائی کو اچھے مقام پر پہنچا سکتا تھا، اپنے ماں باپ کو تمام آسائشیں دے سکتا تھا اور اس کے بدلے مجھے صرف شہلا سے دور رہنا تھا اور یہ قیمت میں ادا نہیں کر سکتا تھا، اگر اس آفر کو رد کر دیتا تو کیا ہوتا۔ چند ماہ بعد فائنل کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد

میں جاب کی تلاش شروع کر دیتا۔ جاب تو مجھے مل ہی جاتی مگر وہ میری زندگی اور میرے حالات کو بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ الہ دین کا چراغ ثابت نہیں ہو سکتی تھی اور مجھے یہ سب بھی منظور نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے مشکل رات کبھی نہیں گزاری۔

صبح ہونے تک میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے شہلا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا، سب کچھ اسے بتا دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سکتے کے عالم میں رہی تھی اور پھر یوں جیسے اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''پھر تم کیا کرو گے؟'' بہت دیر بعد اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ جیسے پتھر کا بت بن گئی۔ میرے بہت روکنے کے باوجود پھر وہاں نہیں رکی تھی۔ میں جانتا تھا میں نے اس کے دل کا خون کیا ہے مگر زندگی میں بعض دفعہ آپ کو آگے بڑھنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

کئی دن میں کوشش کرنے کے باوجود بھی شہلا سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے پر تیار ہی نہیں تھی مگر ایک دن بہر حال میری منت سماجت رنگ لے آئی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنی مجبوریوں کا لمبا چوڑا نقشہ کھینچ دیا تھا اور وہ مان گئی۔ عورت کی سب سے بڑی خوبی اور خامی یہی ہوتی ہے کہ وہ ''مان'' جاتی ہے۔

بہر حال اس کے بعد ملیحہ سے شادی میں مجھے زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔ چند ہفتوں میں، میں نے اپنے ماں، باپ کو منا لیا تھا اور اس کام میں بھی اہم کردار شہلا نے ادا کیا تھا۔ فائنل کے امتحانات سے فارغ ہوتے ہی میری اور ملیحہ کی شادی طے ہو گئی تھی۔ علیم صاحب ملیحہ کے گارجین تھے اور انھوں نے میرے بارے میں خاصی تحقیق و تفتیش بھی کی تھی مگر پھر ملیحہ کے حق میں اپنا ووٹ ڈال دیا تھا۔ ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی مگر اس شادی پر ملیحہ کے علاوہ درحقیقت کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ میں خوش نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ خوش نظر آنا میرے والدین اور گھر والوں کی مجبوری تھی اور علیم صاحب کی ضرورت، کیونکہ وہ آگے بھی فیکٹری کے معاملات اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے مگر میں اتنا احمق نہیں تھا۔

شادی کے دوسرے ہفتے میں نے فیکٹری کا نظام سنبھال لیا اور جو پہلا کام میں نے فیکٹری سنبھالنے کے بعد کیا تھا وہ علیم صاحب کے بجائے ایک دوسرے لیگل ایڈوائزر کی خدمات لینا تھا۔ علیم صاحب نے اس پر احتجاج کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ ساری کوششیں ملیحہ نے بیکار بنا دی تھیں۔ اس نے بنا چوں چرا کے میرے ہر فیصلے کو قبول کیا تھا۔ میرے لیے ملیحہ کی طرف داری علیم صاحب کو پسند نہیں آئی تھی اور انھوں نے ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا تھا۔ میں یہی سب چاہتا تھا۔

ملیحہ کے اصرار کے باوجود میں اپنے گھر والوں کو اس کے گھر نہیں لایا تھا بلکہ ان کے لیے میں نے ایک الگ بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بھولے سے بھی کبھی ملیحہ کو میرے اور شہلا کے سابق رشتے کے بارے میں پتا چل سکے اور گھر والوں کے ساتھ ہوتے ہوئے اس قسم کی غلطیوں کا بہت امکان تھا۔

ملیحہ ہر لحاظ سے بہت عجیب لڑکی تھی۔ میں نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ وہ اس قدر تابعدار قسم کی بیوی ثابت ہو سکتی ہے مگر وہ تھی۔ آپ شاید ہنس پڑیں لیکن یہ سچ ہے کہ میں اگر دن کو دن کہتا تو وہ بھی یہی کہتی اور اگر رات کو بھی دن ہی کہتا تو بھی اسے میری صداقت پر یقین رہتا۔ بعض دفعہ

مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں اس کی ذات اس کے وجود کا مرکز ہوں اور میں...... میں یہی چاہتا تھا۔ کچھ چیزیں انسان کو بنا مانگے ملتی ہیں۔ وہ بھی میرے لیے ایسی ہی ایک چیز تھی۔

شادی کے دو ماہ کے اندر اندر ہی میری دونوں بہنوں کی نسبتیں بہت اچھے گھرانوں میں طے ہو گئی تھیں اور اس میں بھی بڑا ہاتھ ملیحہ کا ہی تھا۔ اگلے تین ماہ میں، میں اپنی بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو گیا تھا۔ شادی کی تقریبات کا سارا انتظام ملیحہ کے ہاتھ میں تھا اور اس نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ ضرورت کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو میری بہنوں کے جہیز میں نہیں تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔

شادی کے چھ ماہ گزر جانے کے بعد فیکٹری مکمل طور پر میرے ہاتھ میں تھی، لیکن میرے نام نہیں تھی اور ابھی بھی سارے چیکس ملیحہ ہی سائن کرتی تھی، اگرچہ اس نے کچھ اکاؤنٹس میرے نام پہ بھی کھلوا دیے تھے مگر میرے لیے کافی نہیں تھے۔ میں ہر چیز پر اپنا تسلط چاہتا تھا، صرف اپنا تسلط اور میں واضح طور پر اسے یہ سب کہہ کر خود سے برگشتہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے سامنے ہمیشہ میں یہی ظاہر کرتا جیسے میں نے فیکٹری صرف اس کی وجہ سے سنبھالی ہوئی ہے ورنہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ...... وہ اس احسان عظیم کے لیے میری مشکور رہتی۔

میں مختلف فرضی اخراجات کے لیے اس سے لمبے چوڑے چیک سائن کرواتا رہتا اور وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی رہتی لیکن اتنا روپیہ بھی مجھے تسلی نہیں دے پا رہا تھا۔ ابھی بہت کچھ تھا جو مجھے کرنا تھا اور بہت کچھ تھا جس کی مجھے ضرورت تھی اور ہاں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھیں مگر خیر...... میں چیزوں کو بہت اچھی طرح سے پلان کیا کرتا تھا اور یہ ہمیشہ سے ہی میری خوبی رہی ہے۔

مجھے نہیں پتا علیم صاحب کو کب اور کس طرح مجھ پر شبہ ہوا اور کب انھوں نے ملیحہ سے ملاقاتیں شروع کیں اور میرے بارے میں اس کے کان بھرنا شروع کیے۔ مجھے شبہ نہیں ہوا مگر ان دنوں اچانک اس کا رویہ بہت عجیب ہو گیا تھا۔ وہ بہت کنفیوژ سی رہتی۔ بعض دفعہ میری باتوں سے اختلاف بھی کرتی۔ میں چونک گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں بہت اچھی پلاننگ کرتا ہوں۔ میں نے اس سے کھل کر بات کی تھی۔ اس نے وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں جو علیم صاحب نے میرے بارے میں اسے بتائی تھیں۔ میں نے ساری باتوں کے جواب میں ترپ کا پتہ استعمال کیا اور اس سے کہا کہ اگر اسے مجھ پر شک ہے تو میں اسے طلاق دے کر ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے کچھ اور کہنے، کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ بچوں کی طرح بلکتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا اعتماد ایک بار پھر میں نے جیت لیا تھا اور اب مجھے اپنی پلاننگ کے مطابق منصوبے کے دوسرے حصے پر کام کرنا تھا۔

منصوبے کا دوسرا حصہ قدرے مشکل تھا اور یہ مشکل صرف ایک باضمیر انسان کے لیے ہوتی، چنانچہ مجھے یہ مشکل نہیں ہوئی۔ میں نے اسے سلو پوائزننگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ دیکھیں میں جانتا ہوں اس وقت آپ میں سے کچھ کا سانس حلق میں اٹک گیا ہوگا۔ کچھ مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے مگر میں کیا کر سکتا ہوں، اس وقت ملیحہ سے چھٹکارا پانے کا کوئی اور طریقہ میرے پاس نہیں تھا۔ علیحدگی اختیار کرتا تو میں عرش سے فرش پر آ گرتا اس لیے میں نے اس وقت جو ٹھیک سمجھا، وہ کیا۔

وہ بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ بہت جلد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ میں ہر بار اس کی طبیعت خراب ہونے پر یوں ظاہر کرتا جیسے میں

بہت پریشان ہوں اور پھر خود ہی اسے میڈیسن وغیرہ لا دیتا۔ میں کسی طرح سے بھی یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور وہاں چیک اپ میں یہ بات سامنے آ جائے کہ اسے سلو پوائزننگ کی جا رہی ہے۔ جب افاقہ نہ ہونے پر اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے پر زیادہ اصرار کیا تو میں ایک فرضی ڈاکٹر گھر بھی لے آیا۔ اس نے جو میڈیسنز اس کے لیے تجویز کیں میں نے ان ہی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ میں منتظر تھا وہ ذہنی طور پر Collapse کرے اور میں فیکٹری اپنے نام لگوانے کی کوششیں شروع کروں۔ جسمانی طور پر اگرچہ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی مگر ابھی تک ذہنی طور پر اس کی صلاحیتیں برقرار تھیں۔

ان ہی دنوں فیکٹری کے کسی کام کے لیے مجھے دو ہفتے کے لیے کراچی جانا پڑا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ منصوبے کے اس اہم مرحلے پر مجھے اس طرح غائب نہ ہونا پڑے لیکن مجھے جانا ہی پڑا۔ دو ہفتے کے بعد جب میں واپس آیا تو وہ بستر پر پڑی ہوئی نہیں ملی۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں چل پھر رہی تھی۔ میں بے تحاشا فکر مند ہوا تھا لیکن میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی صحت کی بحالی پر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس نے میری کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بس یک ٹک مجھے گھورتی رہی تھی۔ مجھے اس کی خاموشی سے کچھ خوف آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے میرے ہاتھ سے بریف کیس اور کوٹ پکڑ لیا اور اندر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔

''تم چینج کر لو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔''

وہ کمرے سے یہ کہہ کر نکل گئی۔ بظاہر یہ بہت سادہ سا جملہ تھا مگر اس وقت اس کے منہ سے یہ سادہ نہیں لگا تھا۔ اس وقت کوئی بہت عجیب سی بات تھی اس کے لہجے میں۔ میں سر جھٹکتے ہوئے باتھ روم میں چلا گیا تھا۔ وہاں ہمیشہ کی طرح میرے کپڑے ہینگر میں لٹکے ہوئے ملے تھے۔ میں نے اپنے ذہن سے خدشات کو نکالنے کی کوشش کی۔

اس شام پہلی بار ہم دونوں نے مکمل خاموشی کے عالم میں کھانا کھایا۔ میں وقتاً فوقتاً اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ یک لفظی جواب دے کر اس خاموشی کو قائم رکھتی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں بیڈ روم میں آ گئے تھے۔ میں اس وقت بیڈ پر لیٹ رہا تھا جب اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

میں اس کی بات پر چونک گیا تھا۔ وہ بیڈ کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ بعض دفعہ خاموشی میں طوفان ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی گفتگو شروع کرنے سے ہوا تھا۔

''میں دو سال کی تھی جب میری امی کی ڈیتھ ہو گئی۔ میں ماں نام کی کسی چیز، کسی رشتے سے شناسا نہیں رہی۔ میں نے اپنا سارا بچپن تنہائی میں گزارا ہے۔ تنہائی انسان میں بہت سی خواہشات پیدا کرتی ہے۔ میں بھی بہت سی چیزوں کی تمنا کرنے لگی۔ تنہائی آپ کو خواب بننا سکھا دیتی ہے۔ میں نے بھی بہت سے خواب بُن لیے۔ مجھے یقین تھا ساری عمر میں صرف خواب نہیں بنوں گی۔ ایک وقت آئے گا جب میری زندگی میں کوئی ایسا شخص ہو گا جو مجھے بہت چاہے گا۔ میری اتنی پروا کرے گا کہ مجھے کبھی دوبارہ تنہا بیٹھ کر خواب بننے نہیں پڑیں گے۔ میں انیس سال کی تھی جب پاپا کی ڈیتھ

ہوئی۔ میرا یقین اور گہرا ہو گیا۔ جب اندھیرا بہت گہرا ہو جائے تو پھر اس نے چھٹنا ہی ہوتا ہے۔''

وہ اپنی ہتھیلیوں پر نظریں جمائے اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ کوما میں ہو۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا جو اس وقت جھکا ہوا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں بس خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

''پھر کچھ سالوں کے بعد میں نے تمہیں دیکھا۔ میں تم سے ملی اور مجھے یوں لگا جیسے تم ہی وہ شخص ہو جسے خدا نے میرے مقدر میں لکھا ہے۔ پتا نہیں ہیر نے رانجھے سے کتنی محبت کی ہو گی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ سوہنی نے مہینوال کو کتنا چاہا ہو گا۔ ہاں مگر میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ سب میری محبت سے بڑھ کر نہیں ہو گا۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ محبت یکطرفہ تھی۔ میں تمہیں چاہتی تھی، تم کسی اور کو۔''

مجھے یوں لگا تھا کسی نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، وہ سنے بغیر بولتی رہی۔

''میرے پاپا ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ انسان کو جیتنا ہے تو قربانی سے جیتو، ایثار سے جیتو۔ میں نے بھی تمہیں ان ہی چیزوں سے جیتنے کی کوشش کی تھی۔ میری عمر پچیس سال ہے۔ پچیس سال میں پچیس کروڑ دفعہ میرا دل چاہا ہے۔ کوئی ملیحہ کو چاہے، صرف ملیحہ کو۔ اس کی دولت، اس کے نام ونسب کو ایک طرف رکھ کر کوئی صرف ملیحہ کی بات کرے۔ مجھے لگتا تھا تم وہی ہو جو یہ کر سکتا ہے جو یہ کرے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بعض لوگوں کی قسمت بہت خراب ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ خراب ہی رہتی ہے۔ ان کے ہاتھ کبھی کوئی پارس نہیں لگتا۔ ملیحہ علی بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ میں دوسروں کے خواب اجاڑوں۔ فاروق! کیا تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ میں خود غرض نہیں ہوں۔ میرا دل اور ظرف دونوں ہی بڑے ہیں؟''

اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ مجھے اس کے گالوں پر آنسوؤں کی قطاریں نظر آئی تھیں مگر اس وقت میرے پاس ان آنسوؤں پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں تو اس کے سوال پر گھبرا گیا تھا۔

''تم سے شادی سے پہلے اگر ایک بار بھی مجھے یہ پتہ چل جاتا کہ تمہاری نسبت طے ہے اور تم کسی اور سے محبت کرتے ہو تو میں کبھی تمہارے اور شہلا کے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرتی۔''

میں ساکت رہ گیا تھا۔ دو ہفتے میں پیچھے کیا ہوا تھا میں جاننے سے قاصر تھا مگر سونے کی چڑیا میرے ہاتھ سے اڑ گئی تھی۔ میں دم بخود اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''تمہیں مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔ تمہیں مجھ سے کہنا تو چاہیے تھا۔ تم نے ہر چیز کی بنیاد جھوٹ پر رکھی، مگر اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔ میری غلطی تھی مگر فاروق! بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اسی طرح کی شادی کرنی پڑتی ہے۔ ان کی بیوی ان کی پسند کی نہیں ہوتی مگر پھر بھی وہ گزارا کرتے ہیں۔ محبت نہ سہی محبت کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ عشق نہ سہی ترس تو کھاتے ہیں۔ میں نے پچھلے دو ہفتے میں اپنی شادی کے آٹھ ماہ کے ایک ایک لمحے کے بارے میں سوچا ہے۔ میں یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی ہوں کہ کب مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ کوئی ایسی غلطی کہ میں تمہارے دل سے اتر گئی۔ کوئی ایسی غلطی کہ تم مجھ سے چھٹکارا پانے کا سوچنے لگے۔''

میرے پیروں تلے سے پہلی بار زمین نکل گئی تھی۔ میں نے اب کچھ کہنا ضروری سمجھا تھا۔

''ملیحہ تم کیا......''اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی تھی۔

''میں نے پچھلے آٹھ ماہ میں تمھیں سننے کے سوا اور کچھ نہیں کیا لیکن آج نہیں سنوں گی۔ آج تم صرف کہوں گی۔ آج تم سنو۔ تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔ فاروق تم نے کبھی سوچا ہے، میں نے تم پر کتنے احسان کیے ہیں اگر تم گننے بیٹھو تو تمھیں گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں نے تم سے عشق کیا ہے، تمھیں پتا ہے عشق کیا ہوتا ہے؟ اگر ساری دنیا تمھیں چھوڑ دیتی تو صرف میں تھی جو تمھارے ساتھ ہوتی مگر تمھیں تو میرے ساتھ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے ان آٹھ ماہ میں ایک بار بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی پھر بھی تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔''

''اے خدا کیا سارے انکشافات آج ہی ہونے تھے؟''میں اپنی جگہ پر لرز گیا تھا۔

''عورت سے محبت کیوں کی جاتی ہے؟''

اب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''اس کی خوبصورتی کی وجہ سے، یا اس کی دولت کی وجہ سے، یا اس کے نسب کی وجہ سے، یا اس کی اطاعت کی وجہ سے۔ مجھ میں تو یہ سب کچھ ہی تھا پھر تمھیں مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوئی؟''اتنی محبت نہ سہی جتنی مجھے تم سے تھی، تھوڑی سی ہی سہی۔ ایک فیکٹری کے لیے تم مجھے قتل کر دینا چاہتے ہوتا کہ اس کے مالک کہلاؤ۔ مالک تو تم تھے۔ اس ایک گھر کے لیے تم مجھے مارنا چاہتے تھے تاکہ تم یہاں شہلا کو بسا سکو۔''

''ملیحہ! تمھیں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تمھیں شاید خود بھی پتا نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''نہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اب تو کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ پتا ہے فاروق! اس وقت میں تمھیں اس طرح دیکھ رہی ہوں جیسے لوگ شیشے کے آر پار دیکھتے ہیں۔ تمھارا اندر، تمھارا باہر سب میرے سامنے ہے۔ کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ کم از کم اس وقت تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ چیزیں چاہیے تھیں تو آتے میرے سامنے کہتے مجھے۔ ملیحہ، مجھے یہ گھر چاہیے۔ یہ فیکٹری چاہیے۔ میں انکار کرتی تو آخری حربہ آزماتے۔ میں انکار کرتی تب......ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کم از کم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے سامنے یہ سب کنکر پتھر بھی نہیں لگتے۔ ایک فیکٹری کیا میں دنیا دے سکتی تھی تمھارے بدلے، تم ایک بار کہتے تو، مانگ کر دیکھتے۔ کیا چاہیے تھا؟ تمھیں جان چاہیے تھی میری۔ آتے میرے پاس کہتے ملیحہ اس کھڑکی سے کود جاؤ، یہ خنجر اپنے سینے میں مار لو، اس پھندے سے لٹک جاؤ۔ میں انکار نہیں کرتی، میں انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔''

وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر کندھوں پر ہاتھ رکھنے چاہیے۔ اس نے مجھے دھکیل دیا۔

''مجھ سے دور رہو۔ میرے پاس مت آؤ۔ مجھے گھن آتی ہے تم سے۔ میں نے تمھیں کیا سمجھا اور تم کیا تھے۔ ہر ایک کو پیسہ کیوں چاہیے ہوتا ہے۔ صرف پیسہ، صرف دولت، وجود کی اہمیت نہیں، انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔ صرف فیکٹری، صرف گھر، صرف بنک بیلنس، صرف دولت۔''

وہ اب گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ مجھے اس وقت وہ ابنارمل لگ رہی تھی شاید مجھے ہی نہیں اس وقت وہ آپ سب کو بھی ابنارمل ہی لگتی۔

"تمھیں چیزیں چاہیے نا چیزیں۔ میں دوں گی تمھیں۔ تمھارے مانگے بغیر، تمھارے کہے بغیر، جیسے لوگ بھکاری کو دیتے ہیں۔ یہ دیکھو پیپرز۔ میں نے سب کچھ تمھارے نام کر دیا ہے۔ یہ فیکٹری، یہ گھر، اپنی ساری جائیداد، سارے اکاؤنٹس، سب کچھ۔"

وہ یک دم کہتے ہوئے الماری کی طرف گئی تھی اور اس نے کاغذات کا ایک ڈھیر میری طرف اچھال دیا تھا۔ میں دم بخود تھا۔ کیا خدا اتنا مہربان ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔

"اور اس سب کے بدلے مجھے تم سے بس ایک چیز چاہیے، صرف ایک چیز...... چھٹکارا، طلاق ابھی اور اسی وقت اس کاغذ پر۔"

سارے کاغذات اچھالنے کے بعد وہ ایک آخری کاغذ ہاتھ میں لے کر میرے پاس آئی تھی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا قلم میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا پھر میں نے اس کے ہاتھ سے قلم اور کاغذ پکڑ لیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر کاغذ رکھ کر میں نے طلاق نامہ لکھ دیا تھا۔

میں جانتا ہوں آپ مجھ پر لعنت بھیج رہے ہوں گے لیکن میں نے کیا غلط کیا اگر خدا پلیٹ میں رکھ کر مجھے کچھ دے رہا تھا تو میں انکار کیوں کرتا۔ آپ میں سے کتنے ہیں جو ایسی صورت حال میں انکار کرتے ہوں گے۔ میں نے کاغذ کو سائیڈ ٹیبل پر ہی رہنے دیا تھا۔ سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ آپ یقین کریں زندگی میں پہلی دفعہ میں نے کسی کی آنکھوں کو دھواں بنتے دیکھا تھا۔ چند سیکنڈز وہ پلکیں جھپکائے بغیر میرے چہرے کو دیکھتی رہی تھی پھر آگے بڑھ کر اس نے وہ کاغذ اٹھا لیا تھا۔

اس نے وہ کاغذ اپنی مٹھی میں بھینچ لیا پھر قالین پر الٹے قدموں چلتی ہوئی وہ دروازے تک گئی تھی اور جوتا پہنے بغیر نکل گئی تھی۔ میرا خیال تھا وہ جانے سے پہلے کچھ کہے گی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مجھے اس وقت وہ ابنارمل لگی تھی۔ پتہ نہیں کیوں لیکن چند لمحوں کے لیے میں اس کے پیچھے آیا تھا۔

وہ ننگے پاؤں تیزی سے سیڑھیاں اترتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دینے کی کوشش نہیں کی بس دیکھتا رہا۔ وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں تیزی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھڑکی کے پردے ہٹا کر میں نے باہر جھانکا تھا۔ گیٹ پر جلنے والی لائٹس میں وہ اسی طرح تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جا رہی تھی پھر میں نے چوکیدار کو گیٹ کھولتے اور اسے گیٹ سے نکلتے دیکھا تھا اور پھر...... پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔

آپ نہیں جانتے۔ اس کے جانے کے بعد میرا پہلا احساس کیا تھا۔ خوشی کا، بے تحاشا خوشی کا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں رقص کروں، قہقہے لگاؤں، چیخوں چلاؤں۔ میں قتل جیسے بڑے گناہ سے بچ گیا تھا اور میں نے وہ سب کچھ بھی حاصل کر لیا تھا جس کی خاطر میں نے ملیحہ کو مارنے کی کوشش کی تھی۔

پہلا فون جو میں نے کیا تھا۔ وہ شہلا کو تھا آپ کو چونکنے کی ضرورت نہیں ہے یاد کریں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نے شہلا کو ملیحہ سے شادی پر منا لیا تھا وہ دراصل میرا سارا منصوبہ سن کر ہی رضامند ہوئی تھی۔ تب تک میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اسے قتل کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ شاید تب تک مجھے امید تھی کہ میں اس کام کے بغیر ہی اس کی فیکٹری پر قابض ہو جاؤں گا، خیر تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ شہلا میری بات مان گئی تھی۔ ملیحہ سے شادی کے بعد میں نے اس کے لیے بھی بہت کچھ کیا تھا۔ کسی رشتہ کے بغیر ہی میں نے اس کا اور اس کے گھر کا پورا خرچ اٹھایا ہوا تھا۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب میں ملیحہ کے ساتھ کیا کر رہا تھا لیکن وہ جلد از جلد اس گھر میں آنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا میں نے فون پر جب اسے سارا واقعہ سنایا تو وہ جیسے چیخ اٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ خدا ہم پر اتنا مہربان ہو سکتا ہے۔ بہر حال خدا مہربان ہو گیا تھا۔

اگلے کچھ دن بعد ایک وکیل میرے پاس آ کر کچھ اور کاغذات بھی میرے حوالے کر گیا۔ میں نے باقاعدہ طور پر سارے کاغذات کو اپنے وکیل سے چیک کروایا تھا۔ سب کچھ واقعی ہی مکمل تھا۔ کچھ پرابلمز تھے تو ملیحہ کے وکیل نے وہ بھی حل کر دیے، چند ماہ بعد میں قانونی طور پر ملیحہ کی تمام جائیداد کا مالک بن چکا تھا۔

اور جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میں نے سب سے پہلا کام شہلا سے شادی کا کیا تھا یہ وہی تو تھی جس کی محبت نے مجھے اس دور کا ''کوہ کن'' بننے پر مجبور کیا تھا، بڑی دھوم دھام سے میں اسے بیاہ کر اس گھر میں لے آیا تھا۔

ملیحہ کے کمرے کو لاک کر دیا گیا تھا ہم ایک دوسرے کمرے میں شفٹ ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے اس کی درازوں سے ساری جیولری اور روپیہ نکال کر میں نے شہلا کے حوالے کر دیا تھا ملیحہ کے پاس لاکھوں کا زیور تھا مگر اسے جیولری پہننے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ شہلا کو شوق تھا اور وہ سب زیور اس پر بجتا بھی تھا۔

زندگی تب بھی بہت ٹھیک گزر رہی تھی۔ میں اور شہلا بہت خوش تھے۔ ہم دونوں کے خواب جو پورے ہو گئے تھے میں فیکٹری پر بہت محنت کر رہا تھا، ظاہر ہے صرف ایک فیکٹری میرا خواب نہیں تھی میں 1+1 گیارہ کے فارمولے پر عمل کر رہا تھا۔ اور اس رات کے تین بجے اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی، عجیب بات تھی کہ آنکھ کھلنے کی وجہ ملیحہ تھی۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا، روتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھے ہوئے۔ بس فرق یہ تھا اس بار میں نے اسے اپنے کمرے کے قالین پر نہیں ایک لمبے چوڑے اجاڑ میدان میں دیکھا تھا اور اس بار اس نے ایک بار بھی سر نہیں اٹھایا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا، مگر جانتا تھا کہ وہ ملیحہ ہی تھی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ سچ ہے میں باقی رات سو نہیں سکا۔ پہلی بار مجھے خیال آیا تھا وہ کہاں گئی تھی۔ دولت کے بغیر خالی ہاتھ اسے کس نے قبول کیا ہو گا۔ مجھے آپ کو بتانا چاہیے کہ اس دن اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد میں کئی دن تک منتظر رہا تھا کہ وہ آئے گی اور اپنا سامان لے جائے گی۔ کوئی بھی اس طرح تو کبھی گھر چھوڑ کر نہیں جاتا مگر وہ نہیں آئی تھی۔ نہ ہی اس نے کسی کے ذریعے کچھ منگوانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ جان سکوں کہ اسے شہلا اور اپنے قتل کے منصوبے کا کیسے پتا چلا۔ یہ تو مجھے ملازموں سے پتا چل گیا تھا کہ وہ میرے کراچی جانے کے بعد باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی تھی اور یقیناً ڈاکٹر نے اگر اس کے ٹیسٹ کروائے ہوں گے تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکی ہو گی کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے مگر میں یہ نہیں جان سکا کہ اسے شہلا کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا۔ خیر میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ میں اس پوری رات جاگتا رہا۔

میں نہیں جانتا کیوں، لیکن صبح آفس جاتے ہی میں نے سب سے پہلے ملیحہ کے وکیل کو فون کیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا وہ کہاں ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنا فون نمبر دیا تھا میں اسی فون نمبر پر رنگ کر کے ان سے بات کیا کرتا تھا۔''

اس نے مجھے ایک فون نمبر لکھوا دیا تھا۔ میں نے اس فون نمبر پر رنگ کیا تھا۔

''ہاں وہ چند ہفتے یہاں رہی تھی مگر جب جائیداد آپ کے نام ٹرانسفر ہوگئی تو ایک دن وہ کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلی گئی اس کے بعد دوبارہ اس کے ساتھ ہمارا رابطہ نہیں ہوا۔''

وہ فون نمبر ملیحہ کی ایک دوست کا تھا اور فون کرنے پر اس کی والدہ نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔ میں نہیں جانتا پھر مجھے کیا ہوا تھا مگر اس کے بعد میں ہر بار نمبر گھماتا رہا تھا جو اس کے کسی رشتہ دار کا ہو سکتا تھا اور میری ڈائری میں تھا، اس کے بارے میں کسی کو بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھ سے شادی سے پہلے بھی وہ رشتہ داروں کے کچھ زیادہ قریب نہ تھی۔ اور شادی کے بعد تو بالکل ہی کٹ کر رہ گئی تھی اور اب جب وہ خالی ہاتھ تھی تو ان لوگوں کے پاس کیسے جا سکتی تھی۔ یا اگر چلی بھی جاتی تو وہ اسے کیسے رکھ سکتے تھے۔ مگر پتا نہیں مجھے کیوں آس تھی۔

اگلے کئی ہفتوں میں اس کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے پورا شہر پھرتا رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی پتا نہیں چلا، وہ اپنی دوست کے علاوہ کسی اور کے پاس گئی ہی نہیں تھی۔ پھر میں نے اس کی تلاش ختم کر دی۔ مگر اس رات سے لے کر تیس سال تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں رات کو سلیپنگ پلز لیے بغیر سویا ہوں۔

مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں تھی، جب وہ میرے پاس تھی تو مجھے صرف شہلا کا خیال آیا کرتا تھا اور جب وہ چلی گئی تو میں اس کے الوژن میں گرفتار ہو گیا تھا مجھے پتا نہیں چلتا اور وہ میرے اور شہلا کے درمیان آ جاتی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور میں شہلا کے چہرے پر اس کے چہرے کو تلاش کرنے لگا۔

ملیحہ بہت عجیب تھی بعض دفعہ وہ مجھے رات کے دو بجے اٹھا دیتی۔

''میرا دل چاہتا تھا میں تم سے بات کروں، فاروق! پہلے جب میں رات کو کبھی اس طرح اچانک بیدار ہوتی تھی تو ایسا کوئی نہیں ہوتا تھا جس سے میں بات کر سکتی۔ مگر اب تم ہو تو پھر میں تم سے بات کیوں نہ کروں۔''

وہ آنکھیں بند کیے میرے کندھے پر سر رکھے بولتی جاتی اور میں دل ہی دل میں اس طرح نیند خراب ہونے پر پیچ و تاب کھاتا، ہر بار جب شہلا میرے کندھے پر سر رکھتی تو مجھے ملیحہ یاد آ جاتی اور پھر، پھر شہلا کہیں غائب ہو جاتی تھی۔ جب ملیحہ کو مجھ پر بہت پیار آتا تو وہ میرا دایاں ہاتھ پکڑ لیتی۔ پھر وہ سارا وقت وہی ہاتھ پکڑ کر بات کرتی رہتی، کبھی وہ ہاتھ اپنے گال سے لگا لیتی، کبھی بالوں پر رکھ لیتی، کبھی اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے سہلاتی رہتی، یوں جیسے وہ ہاتھ اس وقت مجسم میں تھا۔ ہر بار جب شہلا اس ہاتھ کو پکڑتی تو میرا دل چاہتا میں اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لوں۔ مجھے لگتا جیسے اس کا لمس ملیحہ کے لمس کو معدوم کر دے گا۔

پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کب میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر ملیحہ کے بیڈروم میں جانا شروع کر دیا۔ وہ کمرہ پہلے ہی کی طرح تھا بس ہر چیز پر گرد کی ایک بھاری تہہ چڑھتی جا رہی تھی۔ میں جب بھی رات کے پچھلے پہر وہاں جاتا، چیزوں کو ہی صاف کرتا رہتا اس وقت میں جیسے اپنے آپ میں نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے نا مگر یہ سب سچ ہے مگر مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ کبھی بھی نہیں اگر وہاں نہ جاتا تو اس رات مجھ پر وہ ہولناک

انکشاف بھی نہ ہوتا۔ بعض لوگوں کو تقدیر مارتی ہے بعض کو وہ خود میرا خیال ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے خود اپنے آپ کو مارا ہے۔ پتا نہیں بات کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے۔ میں آپ کو اس انکشاف کے بارے میں بتا رہا تھا ہولناک انکشاف کے بارے میں۔

اس رات بھی میں اس کے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے دراز کھول کر چیزوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھا جب میرے ہاتھ کچھ کاغذ لگے تھے۔ مجھے انھیں دیکھنا نہیں چاہیے تھا مگر...... میں نے دیکھے وہ کچھ رپورٹس تھیں جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے خون میں اس خاص قسم کے زہر کے اثرات تھے جو میں اسے دیے جا رہا تھا ان رپورٹس میں کچھ اور بھی تھا وہ پریگننٹ تھی۔ میں جانتا ہوں، آپ ساکت ہو گئے ہوں گے میں بھی اس رات اسی طرح سکتے میں آیا تھا، اور آج تیس سال بعد تک یہ سکتہ اسی طرح قائم ہے وہ رپورٹس انھیں دو ہفتوں میں بنوائی گئی تھیں جب میں کراچی میں تھا۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف عورت بھی کبھی وہ نہ کرتی جو اس نے کیا تھا۔ مجھ سے طلاق لی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پریگننٹ تھی۔ ہر چیز میرے منہ پر ماری اور پھر کسی نام و نشان کے بغیر دنیا میں غائب ہو گئی، یقیناً آپ بھی ایسی کسی احمق عورت کو نہیں جانتے ہوں گے۔ میں نے وہ رپورٹس وہیں رکھ دی تھیں۔

آپ اندازہ کر ہی سکتے ہیں پھر میں نے کیا کیا ہوگا۔ میں نے اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا تھا جس نے وہ رپورٹس دی تھیں۔

”نہیں، یہ بس ایک بار ہی آئی تھیں پھر دوبارہ نہیں آئیں۔“

مجھے وہی جواب ملا تھا جس کا مجھے اندازہ تھا پھر میں اسے ڈھونڈنے کے لیے جو کر سکتا تھا میں نے کیا تھا، آپ یقین کریں میں نے واقعی ہی اس کی تلاش کے لیے سب کچھ کیا تھا سب کچھ...... دعا بھی مگر وہ نہیں ملی، میں نے دعا کی تھی وہ مل جائے خدا میرے جیسے لوگوں کی دعا کبھی قبول نہیں کرتا، اس لیے وہ نہیں ملی، میں یہ جان گیا تھا مگر تب جب میں اس کے مل جانے کی دعا کر چکا تھا ورنہ شاید میں اس کے نہ ملنے کی دعا کرتا۔

میں اس کے کمرے میں تب تک جاتا رہا تھا جب تک شہلا کو علم نہیں ہو گیا وہ ایک رات میرے پیچھے آ گئی تھیں۔ اور اس کے بعد میں دوبارہ اس کے کمرے میں نہیں گیا۔ کم از کم تب تک جب تک میں شہلا کے ساتھ اسی گھر میں رہا۔

تیس سال میں میں نے بہت ترقی کی ہے ملیحہ کی فیکٹری کے علاوہ سات اور فیکٹریاں لگالی ہیں جن کے سامنے ملیحہ کی فیکٹری بہت چھوٹی اور معمولی لگتی ہے۔ اس شہر کے علاوہ چند اور شہروں میں بھی بہت شاندار بنگلے تعمیر کروا لیے ہیں۔ جن کے سامنے اب ملیحہ کا بنگلہ ایک ڈربہ لگتا ہے۔ ملیحہ کی فیکٹری اب منافع کم دیتی ہے مگر اس پر اخراجات زیادہ اٹھتے ہیں۔ میرے بیٹے چاہتے ہیں اس فیکٹری کو بند کر دیا جائے۔ میرے زندہ رہنے تک تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ ملیحہ کا بنگلہ بھی بہت پرانا ہو چکا ہے مگر میں نے وہاں کی ہر چیز محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ ملیحہ کے زمانے میں تھا۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے شہلا نے اصرار کیا تھا کہ میں وہ گھر بیچ دوں، تیس سال کی ازدواجی زندگی میں ہمارے درمیان واحد جھگڑا اسی بات پر ہوا تھا۔ اس کے بعد کبھی کسی بات پر جھگڑا نہیں ہوا۔ شہلا نے دوبارہ کبھی وہ گھر بیچنے کے لیے نہیں کہا شاید میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں ہر روز کچھ وقت کے لیے وہاں ضرور جاتا ہوں۔ گھر کے اندر نہیں جاتا صرف باہر لان میں بیٹھ کر آ جاتا ہوں۔ اندر جانے سے بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ تیس سال سے میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اگر میری قسمت میں دولت تھی تو وہ تو مجھے ملنا ہی تھی چاہے میں ملیحہ کو اس

کا ذریعہ بنا تا یا نہ بنا تا۔ تیس سال سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا۔ اسے مجھ سے سب کچھ چھین کر مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکلوا دینا چاہیے تھا، اس نے اس کے برعکس کیوں کیا۔ خود گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی، اور......اور......کہاں چلی گئی۔ تیس سال سے میں یہ سوچ رہا ہوں، کیا وہ زندہ ہے؟ اسی شہر میں ہے؟ اور اگر ملیحہ زندہ ہے تو پھر ''وہ'' بھی زندہ ہوگا یا زندہ ہو''گی''۔ تیس سال سے میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ کیا ملیحہ نے ''اسے'' میرے بارے میں بتایا ہوگا، سب کچھ......؟ تیس سال سے میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ کیا وہ دونوں مجھے یاد کرتے ہوں گے؟......محبت سے......؟ اور تیس سال سے میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ انھوں نے تیس سال کیسے گزارے ہوں گے؟

آپ یقین کریں میں واقعی سوچتا ہوں کہ میں نے ملیحہ کے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ اور تیس سال سے اس کا خیال میرے ذہن سے جاتا ہی نہیں......نہیں اب آپ غلط سوچ رہے ہیں مجھے اس سے محبت نہیں ہے، یقین کریں مجھے بالکل بھی اس سے محبت نہیں ہے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں شہلا سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں، تو جب میں شہلا سے محبت کرتا ہوں تو پھر مجھے ملیحہ سے محبت کیسے ہو سکتی تھی۔

مجھے دراصل......ملیحہ سے ''عشق'' ہوا تھا۔



بات عمر بھر کی ہے

میرا سانس ابھی تک رکا ہوا ہے میں ایک سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ ابھی ابھی جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ہاں اس کے بعد بھی وہ بے حد نارمل ہے۔ بہت پر سکون ہے۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر کرسی پر پھینک دیا ہے۔ اب وہ اپنے سفید کھلے کرتے کی آستینیں فولڈ کر رہی ہے اور پھر اس نے اسٹیپس میں کٹے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوئے ریشمی بالوں کو ہیئر بینڈ میں باندھا ہے۔ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس سے پانی پینے کے بعد اب وہ فریزر سے آئسکریم نکال کر کھانے لگی ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر اور مطمئن ہے۔ اس کی سانولی رنگت یک دم مجھے اجلی لگنے لگی ہے۔ اس کا عام سا چہرہ میرے لیے بہت خاص بن گیا ہے۔

مجھے وہ بیٹی نہیں ایک مرد لگ رہی ہے۔ اونچا، لمبا، چوڑا، پُر اعتماد، بے خوف مرد جسے کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی جو دوسروں کو تحفظ دے سکتا ہے۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہے مگر جانتی ہے میں یہیں کھڑی ہوں میں چاہتی بھی نہیں۔ وہ مجھے دیکھے، میرا جی چاہ رہا ہے، میں جا کر اس کے پیروں سے لپٹ جاؤں اس کی گود میں چھپ جاؤں۔ اس کے سینے میں منہ چھپا لوں پھر روؤں دھاڑیں مار مار کر، مگر میں اب بھی پتھر کے بت کی طرح ساکت ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے، وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ کوئی اور ہے میں نے تو اپنی بیٹی کو یہ سب کچھ کبھی بھی نہیں سکھایا پھر میرے سکھائے بغیر اسے یہ سب کیسے آ گیا۔

میرا وجود خوف، شکست خوردگی، بے اعتمادی اور مایوسی کا منبع تھا۔ پھر اس منبع نے سنبل جیسا موتی کیسے تراش لیا تھا۔ اسے وہ کون سا گر، کون سا ہنر آتا تھا جس نے اسے مکمل کیا تھا۔

دھیرے دھیرے میں پلکیں جھپکنے لگی ہوں، میں نے دیوان سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی ہیں۔ پانی میرے گال بھگونے لگا ہے۔ یہ کسی دکھ، کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں، بعض دفعہ بے تحاشا خوشی بھی تو رلاتی ہے۔ یہ ایسے ہی آنسو ہیں، بند آنکھوں نے سنبل کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ مگر ذہن سے نہیں۔

میرا دل چاہ رہا ہے، تیس سال بعد آج میں بالآخر ہنسوں، قہقہے لگاؤں رقص کروں، چیخوں چلاؤں۔ بھاگوں ہر ایک کو بتاؤں۔ اس خزانے کے بارے میں جو پچھلے بائیس سال سے میرے پاس تھا اور مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ لوگوں کو بتاؤں کہ میرے پاس کیا ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہے ان سے کہوں کہ سنبل، ہاں سنبل میری بیٹی ہے۔ وہ میری ہے، صرف میری۔"

"آپ مجھے نہیں جانتے۔ پچھلے بہت سے سالوں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں نے کبھی آپ کو اپنے بارے میں بتانے کی کوشش ہی نہیں کی میرا خیال ہے، مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے کی ہمت ہی نہیں تھی اور اب میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں آپ میں سے ایک ایک کو پکڑ کر اپنے

بارے میں بتاؤں۔ مومنہ عادل کے بارے میں ہاں میرا نام مومنہ عادل ہی ہے۔ نہیں مومنہ عادل تو تیس سال پہلے تھا اب مومنہ فاروق ہے۔ میں کون ہوں یہ مجھے بیالیس سال بعد پتا چلا ہے آپ ٹھیک سمجھتے ہیں میری عمر بیالیس سال ہی ہے۔

بیالیس سال پہلے میرے باپ کے گھر میں ایک ننھے سے سانولے وجود نے جنم لیا۔ سب کو بے تحاشا حیرت ہوئی تھی۔

''سانولی رنگت تو ہماری پچھلی سات پشتوں میں نہیں ہے پھر یہ۔''

میری دادی نے مجھے اٹھاتے ہوئے کچھ حیرت زدہ ہو کر کہا۔

میری پھوپھو نے بات ہنسی میں اڑائی تھی۔ مگر بات ہنسی میں ختم نہیں ہوئی۔ میں دو بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ ماں باپ کی آخری اولاد تھی۔ فطری طور پر انہیں مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہونی چاہیے تھی مگر ایسا ہوا نہیں۔ میرے چہرے نے شاید ان کے اور میرے درمیان بہت فاصلہ کھڑا کر دیا تھا۔

بچپن میں میں Ugly Duckling کی کہانی بہت شوق سے پڑھتی تھی اور بار بار پڑھتی تھی مجھے اپنا وجود بھی ایک Ugly Duckling ہی لگتا تھا۔ معمولی، عام اور بدصورت ایسا نہیں تھا کہ میرے ماں باپ اور گھر والوں کو مجھ سے محبت ہی نہیں تھی۔ انھیں محبت تو تھی مگر یہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ کتنی محبت کرنی چاہیے نہ ہی یہ فیصلہ کر پاتے تھے کہ کس قسم کی ہونی چاہیے۔ ہمدردی والی محبت، بھیک والی محبت، مجبوری والی محبت یا فطری محبت۔

اور وہ ساری عمر ہی یہ طے نہیں کر پائے۔ مگر میں نے بہت کچھ طے کر لیا تھا۔ مجھے کیسی زندگی گزارنی ہے اور کس طرح گزارنی ہے یہ میں نے تب طے کر لیا تھا جب شاید مجھے زندگی کے مفہوم سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ جب آپ کے وجود میں کوئی کمی ہو، کوئی بہت بڑی کمی تو پھر آپ کو ہمیشہ دوسرے لوگوں کا سایہ بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔ کبھی آگے آنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اتنا معمولی بن جانا چاہیے کہ کوئی آپ پر سرسری سی نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرے۔ اس طرح آپ اپنے وجود کی اس خامی اس کمی کو چھپا لیں گے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ آپ میں کوئی کمی ہے۔ یہ سب میں اس وقت سوچتی تھی۔

سانولی رنگت اور معمولی شکل مجھے اس وقت اتنی ہی بڑی خامی لگتی تھی اور میں نے وہی سب کچھ کیا جو سوچا۔ میں نے اپنے وجود کو کمپلیکسز کا ایک مجموعہ بنا دیا۔ میں خود کو دوسروں کے سائے میں چھپانے لگی اور کسی نے مجھے یہ سب کرنے سے روکا نہیں، میرے جیسے عام اور معمولی لوگوں کے بارے میں شاید ان کے اپنے ماں باپ بھی ہمدردی سے نہیں سوچتے۔ معمولی لوگوں پر غصہ تو آ سکتا ہے مگر ان سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔

میں نے خاموشی کو اپنے وجود کا ایک حصہ بنا لیا۔ ماں باپ نے سوچ لیا کہ مجھ میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

میں نے لوگوں سے میل جول ختم کر دیا۔ ماں باپ نے سمجھا میں تنہائی پسند ہوں۔ آدم بیزار ہوں۔

میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہونے لگا۔ ماں باپ سب سے کہنے لگے کہ مجھ میں ان کے دوسرے بچوں کی طرح اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں نہیں ہیں۔

کچھ خامیاں مجھے اللہ نے دی تھیں۔ باقی سب گھر والوں نے، زندگی میں اللہ کی دی گئی خامیوں نے مجھے زیادہ نقصان پہنچایا یا گھر والوں کی عطا کردہ خامیوں نے؟ اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

اپنی رنگت کے بارے میں، میں نے اتنی بار لوگوں سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اب اگر کوئی ہمارے گھر آتا اور میری رنگت کے بارے میں کچھ نہ کہتا تو مجھے پریشانی ہونے لگتی۔ مجھے وہ شخص انسان ہی نہیں لگتا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اپنی ساری بدصورتی کے باوجود مجھے اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ ان کی دودھیا رنگت اور تیکھے نین نقش مجھے کسی قسم کے حسد میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ میرے لیے وہ دیوی دیوتاؤں جیسے ہوتے گئے۔ میں ہر وقت ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ان کے کام کرتی۔ ان کے ناز نخرے دیکھتی اور سوچتی خوبصورت لوگوں کو سب کچھ سجتا ہے۔ ادا بھی، غرور بھی، ان کا حق ہوتا ہے کہ ان کی بات مانی جائے۔ ان کے ناز اٹھائے جائیں۔ ان کے حکم سے سرگردانی نہ کی جائے۔ مجھے لگتا تھا جیسے اللہ نے ماں باپ کی اطاعت ہر حال میں لازم کردی ہے۔ اسی طرح بدصورت لوگوں پر خوبصورت لوگوں کی اطاعت واجب ہے۔ یہ فلسفہ مجھے کس نے پڑھایا۔ کس نے سکھایا۔ مجھے خود بھی نہیں پتا بس میرا ذہن زندگی کے لیے جو قواعد وضوابط بناتا رہتا تھا، ان میں سے کچھ اصول اور ضابطے یہ بھی تھے۔

کسی سے میری اتنی دوستی تھی ہی نہیں کہ میں اپنا ذہن اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتی اور میری دوست مجھے کچھ سمجھاتی، زندگی کے کچھ گر سکھاتی۔ مجھے زمین پر قدم جمانا سکھاتی۔ جن سے کچھ دوستی تھی۔ وہ بھی میرے گھر والوں سے مختلف نہیں تھیں۔ باتوں باتوں میں میری رنگت کا تذکرہ کردیتیں پھر ان کا ہر قہقہہ مجھے آگ پر تیزاب کے چھڑکاؤ جیسا لگتا، مجھے یوں محسوس ہوتا، جیسے میرا رنگ کچھ اور سیاہ ہوگیا ہے جیسے میرے چہرے کی بدصورتی کچھ اور بڑھ گئی ہے، میں جانتی ہوں میں اتنی بدصورت نہیں تھی جتنی خود کو سمجھنے لگی تھی۔ صرف ایک سانولی رنگت نے مجھے زندگی بھر کے لیے ایک برزخ میں ڈال دیا تھا اور اس برزخ سے میں پھر بیالیس سال بعد ہی نکل پائی ہوں۔

آپ نے کبھی کمہار کو مٹی کے برتن بناتے دیکھا ہے۔ وہ مٹی کے گندھے ہوئے ڈھیلے کو چاک پر رکھ کر گھماتا جاتا ہے۔ اتنا گھماتا ہے کہ پھر وہ ڈھیلا واضح طور پر نظر آنا بھی بند ہوجاتا ہے۔ مگر اس کی آنکھیں نہیں ہاتھ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ہاتھ مٹی کے ڈھیلے کو برتن بنا دیتے ہیں۔ کوئی پیالہ، کوئی صراحی، کوئی مٹکا، مجھے بھی گندھی ہوئی مٹی کی طرح سب نے مل کر دنیا کے چاک پر گھمایا تھا۔ اور کچھ بنا دیا تھا، مگر جو بنایا تھا اس شئے کی دنیا میں ایک ٹکے کے برابر بھی وقعت نہیں تھی ایک بے مصرف اور ناکارہ وجود، میں نہ پیالہ تھی نہ صراحی نہ مٹکا، میں تو صرف ایک کالی عورت تھی اور کالی عورت بھلا کالی عورت دنیا میں کیسے جیتی ہے؟

وقت گزرتا گیا تھا میں بڑی ہوتی گئی اور اک اور آگہی کے زہر سے آشنا ہوگئی۔ دیکھنے اور نہ دیکھنے، سراہنے اور دھتکارنے، چاہنے اور نہ چاہنے کے درمیان موجود فرق کو جاننے لگی تھی۔ پتا نہیں لوگ آگہی پانے کی دعا کیوں کرتے ہیں۔ آگہی نے میرے وجود کے اندر تو ببول کا درخت کھڑا کردیا تھا۔ جس کا ہر کانٹا مجھے اندر سے لہولہان کرتا رہتا اور میں اللہ سے کہتی رہتی، اللہ تو نے مجھے کالی عورت کیوں بنایا کیا تو نہیں جانتا تھا، کالی عورت ہونا کتنا بڑا عذاب ہے۔ میں نے ساری زندگی اس ایک شکوے کے علاوہ خدا سے کوئی اور شکوہ نہیں کیا۔

میرے تینوں بہن بھائیوں کی شادیاں بہت کم عمری میں ہوگئی تھیں۔ وجہ پھر وہی تھی۔ خوبصورتی، قابلیت۔ خاندان میں سے ہر ایک اپنے بچوں کے لیے ان تینوں پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ میری بڑی بہن عارفہ کی شادی میری خالہ کے بیٹے سے ہوئی۔ وہ خود جتنی خوبصورت تھیں۔ ان

کے شوہر اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھے۔ مبین بھائی کی شادی میرے تایا کی بیٹی سے ہوئی۔ سب سے چھوٹے حسیب بھائی کی شادی ماموں کی بیٹی سے ہوئی۔ ان شادیوں نے میری خاموشی کو اور بڑھا دیا تھا۔ مذاق اڑانے والوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا تھا اگر میرے بہن بھائیوں کی شادیاں خاندان سے باہر ہوتیں تو شاید میرے بہنوئی اور بھابھیاں میرا مذاق اس طرح نہ اڑاتے جس طرح میری کزنز اڑاتی تھیں ان کے لیے میں نند یا سالی نہیں تھی صرف ایک کالی کزن تھی۔



پتا نہیں کیوں اور کیسے مگر میں نے بھی دل میں ایک خواہش پال لی تھی۔ یوں سمجھیے چاند کو پانے کا خواب دیکھ لیا۔ میں اس عمر میں تھی جب لڑکیاں بہت سے خواب دیکھتی ہیں۔ بہت سی آرزوئیں پالتی ہیں اور میری خواہش، میری آرزو تھی کہ میں خوبصورت نہ سہی میرا شوہر بہت خوبصورت ہو۔ میں سفید رنگت نہیں رکھتی نہ سہی، مگر اسے دودھ کی طرح گورا ہونا چاہیے۔ چاہے غریب ہو، چاہے بیمار ہو چاہے معذور ہو، چاہے آوارہ ہو، مگر خوبصورت ہو، مگر سفید ہو پھر میں بھی سب کے سامنے سر اٹھا کر چلوں گی۔ پھر میرے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوگی جسے میں فخریہ طور پر سب کو دکھا سکوں گی۔ میں ہر وقت سوچتی رہتی۔ اپنے فرضی شوہر کا ناک نقشہ ترتیب دیتی رہتی۔

یا اپنی خواہشوں کو مقدس نہ جانیئے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے

شاعر نے یہ شعر شاید میرے جیسے لوگوں کے لیے کہا ہے۔ لیکن خواہش کرنا انسان کے اختیار میں تو نہیں ہوتا ناں جس طرح خواہش نہ کرنا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ ساری بات تو دل کی ہوتی ہے۔

کیا آپ کو یقین آئے گا اگر میں کہوں کہ خدا نے میری یہ دعا قبول کر لی تھی۔ میری یہ خواہش پوری کر دی تھی۔ میں جانتی ہوں آپ لوگ حیران ہو رہے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا مگر یہ سچ تھا۔ میری آرزو واقعی ہی قبول ہو گئی تھی۔ اب آپ جاننا چاہتے ہوں گے کیسے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ہمارے خاندان میں بچوں کی شادیاں یا کم از کم ان کے رشتے بہت کم عمری میں ہی طے کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن بی اے کرنے تک بھی میرا کوئی رشتہ نہیں آیا۔ نہ خاندان سے، نہ باہر سے عجیب بات تھی۔ ہمارے خاندان کے لیے کہ بیس سال کی ہونے تک میرے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں آیا تھا۔ کسی کو میری چاہ، میری آرزو ہی نہیں تھی۔ کسی کو میری ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ وجہ کیا تھی؟ کیا آپ کو دوبارہ یہ بات بتانے کی ضرورت ہے کہ وجہ کیا تھی؟ نہیں نا! سب کے لیے اگر یہ بات حیرانی اور افسوس کی تھی تو میرے لیے تو یہ حقیقت زہر میں بجھا ہوا خنجر تھی جو کسی نے بہت زور سے میرے سینے کے بیچوں بیچ گاڑ دیا تھا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس خنجر کے گاڑے جانے کے بعد بھی میں زندہ تھی کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ میں زندہ تھی؟ یہ ادراک کہ کسی کو آپ کے وجود کی ضرورت ہی نہیں ہے کیا خنجر جیسا نہیں ہوتا؟ آپ بتائیں ہوتا ہے نا؟''

میں جانتی تھی میں ماں باپ کے لیے بوجھ بنتی جا رہی ہوں۔ میں ان کی ناخوشی کا سبب تھی مگر میں ان کا مسئلہ تو حل نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں کب کی شادی کر کے یہ گھر چھوڑ چکی ہوتی مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور مجھ میں دوسروں کو سمجھانے کی اہلیت نہیں تھی۔

جو واحد چیز میں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے وجود کو بے ضرر بنانا تھا۔ اپنے وجود کو قابل قبول بنانا تھا اور وہ میں نے کیا، خاموشی پہلے ہی میرے وجود کا حصہ تھی۔ خدمت کو میں نے وجود کا دوسرا حصہ بنالیا۔ میں ہر وقت ہر کسی کی خدمت کرنے، ہر کسی کو خوش کرنے میں جتی رہتی آپ کو بتاؤں کیوں؟ ویسے کیا آپ خود سے اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نہیں بات وہ نہیں تھی جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے نیکیاں کمانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں تو بس دلوں میں تھوڑی سی گنجائش تھوڑی سی جگہ چاہتی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگا کہ خدمت کر کے میں دل جیت سکتی ہوں۔ مگر خدمت دلوں کو جیت نہیں سکتی۔ بعض دلوں کو تو بالکل بھی نہیں۔ میں آپ کو کیا بتا رہی تھی اور کہاں پہنچ گئی ہوں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ خدا نے میری خواہش پوری کر دی تھی۔ میرے والد میری شادی کے بارے میں بہت پریشان رہتے تھے۔ اور اس پریشانی کا اظہار انھوں نے اپنی بہن یعنی میری پھوپھو سے کیا۔ پتا نہیں، انھوں نے کس طرح انھیں اپنی پریشانی، اپنا مسئلہ بتایا تھا کہ اگلے ہی دن پھوپھو اپنے اکلوتے لائق فائق اور حسین وجمیل بیٹے کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آ موجود ہوئیں۔ سکتہ اگر گھر والوں کو ہوا تھا تو ہکا بکا میں بھی رہ گئی تھی۔ میں نے خدا سے صرف خوبصورتی چاہی تھی اس نے تو جیسے خوبصورتی کو ہر نگینے سے مرصع کر کے میرے لیے بھیج دیا تھا۔

فاروق ایک بنک میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایم اے اکنامکس کیا ہوا تھا۔ پورے خاندان میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت اور قابل تھا۔ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خاندان میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے خاندان سے باہر کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پھوپھو نے اب تک اسے آزادی دی ہوئی تھی کہ جب بھی اسے کوئی لڑکی پسند آئے۔ وہ انھیں بتا دے اور وہ وہیں اس کی شادی کروا دیں گی۔ مگر اب وہ پتا نہیں کیسے اس کا رشتہ میرے لیے لے کر آ گئی تھیں۔

میرے گھر والوں کو اس رشتہ پر اعتراض کیسے ہو سکتا تھا۔ انھیں لگا کہ خدا نے ان پر بہت بڑا کرم کر دیا ہے۔ خاص طور پر مجھ پر فوری طور پر اس رشتہ کو قبول کر لیا گیا اور نہ صرف رشتہ قبول کر لیا گیا بلکہ صرف ایک ماہ بعد ہی میری شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔ ہر انسان بوجھ کو جلد از جلد کندھوں سے اتار کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ میرے ماں باپ نے بھی مجھے بوجھ سمجھتے ہوئے میری قسمت کا فیصلہ بہت جلد کر دیا تھا۔ مگر میں اس جلد بازی سے ناخوش نہیں تھی، بلکہ بہت خوش تھی اور فاروق ہاں اس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ پھوپھو اسے بتائے اور اس سے پوچھے بغیر ہی اس کا رشتہ میرے لیے لے آئی تھیں۔ پھر جب اسے پتا چلا تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ گھر سے ہی چلا گیا تھا۔ مجھے جب یہ پتا چلا تو میری جان جیسے سولی پر اٹک گئی تھی۔ مجھے ہر وقت یوں لگتا جیسے ابھی پھوپھو آئیں گی اور وہ ننھی سی انگوٹھی میری انگلی سے اتار کر لے جائیں گی جو انھوں نے نسبت طے ہونے پر پہنائی تھی اور منگنی ٹوٹنے کی صورت میں میں ایک تماشا بن کر رہ جاتی۔

آپ کو پتا ہے نا ''تماشا'' کیا ہوتا ہے۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ دونوں گھرانوں میں شادیوں کی تیاری اور دولہا کی تلاش ساتھ ساتھ جاری تھی اور پھر فاروق بالآخر خود ہی گھر واپس آ گیا تھا۔ وجہ پھوپھا کی ضد تھی۔ وہ اس کے گھر سے چلے جانے پر اتنا ناراض ہوئے تھے کہ انھوں نے اس کے سارے دوستوں میں اعلان کر دیا

تھا کہ وہ اگر شادی کے دن تک گھر نہ آیا تو وہ پوری بارات کے ساتھ دلہن کے گھر کے سامنے خود کو گولی مار لیں گے۔

فاروق جانتا تھا۔ پھوپھا اپنی بات کے پکے تھے۔ وہ شادی والے دن سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا۔ میں اس وقت بہت خودغرض ہو گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کسی بھی لحاظ سے اس کے برابر نہیں ہوں پھر بھی ہاں پھر بھی میں اس کو پانا چاہتی تھی۔ رات کو ہمیشہ چاند چاہیے ہوتا ہے۔ میں بھی رات تھی اور وہ میرا چاند تھا پھر میں اسے کیسے چھوڑ دیتی۔ اسے پانے کی خواہش کیوں نہ کرتی۔



شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ فاروق پھوپھو کا اکلوتا بیٹا تھا پھوپھو کو تو اپنے ارمان پورے کرنے ہی تھے۔ لیکن ہمارے گھر میں بھی یہ آخری شادی تھی۔ اس لیے ہماری طرف سے بھی بڑی دھوم دھام کا انتظام کیا گیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے میں شادی والے دن بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ لوگ بہت کچھ ایسے ہی کہہ دیتے ہیں۔ خوبصورت لگنا اور بات ہوتی ہے، خوبصورت ہونا اور بات ہوتی ہے۔ فاروق کو میں خوبصورت اس لیے نہیں لگی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا میں خوبصورت نہیں ہوں۔

میرا اصل چہرہ اصل رنگت اس کی نظروں سے کبھی اوجھل ہوئی ہی نہیں۔

''سب جانتے ہیں، یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی، تم بھی اس سے بے خبر نہیں ہو۔ مومنہ! کیا تم کسی بھی لحاظ سے میرے قابل ہو۔ کیا تم میرے ساتھ چلتی پھرتی اچھی لگو گی۔ مجھے تو کالا لباس تک پسند نہیں ہے۔ میں کالی بیوی کے ساتھ کیسے رہوں گا۔ تمہیں قبول ہو یا نہ ہو۔ میں دوسری شادی ضرور کروں گا۔ تم چاہو گی تو تمہیں طلاق نہیں دوں گا اور علیحدہ ہونا چاہو گی تو طلاق دے دوں گا۔''

اس نے پہلی ہی رات مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میں کون ہوں اور بھی بہت سے جملے تھے جو اس نے کہے تھے مگر وہ میں بھول چکی ہوں؟ نہیں بھولی نہیں ہوں مگر بھلا دینا چاہتی ہوں۔ اس طرح تکلیف ذرا کم ہوتی ہے۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ فاروق کی تلخی اور بے اعتنائی بھی اس سے میری محبت کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس تذلیل کے باوجود میں خوش تھی کہ وہ میرا ہے صرف میرا ہے۔ اس کے الفاظ نے میرے دل میں کسی خدشے کو نہیں جگایا تھا۔ میں نے سوچا تھا، میں اس شخص کی اتنی خدمت کروں گی۔ اس سے اتنی محبت کروں گی کہ وہ میرا ہو جائے گا۔ میں اس کا دل جیت لوں گی۔

مگر بس دل ہی تو جیتا نہیں جاتا۔

میں نے اپنے چہرے پر بہت سے ماسک چڑھا لیے تھے۔ ایک ماسک گھر والوں کے لیے، ایک ماسک سسرال والوں کے لیے، ایک ماسک فاروق کے لیے اور ایک ماسک اپنے لیے بعض دفعہ اصلی چہرہ چھپانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

فاروق کا میرے ساتھ سلوک کیسا تھا؟ میں کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں سب کے سامنے یہی ظاہر کرتی کہ میں بہت خوش ہوں، بہت مطمئن ہوں اور آپ کو سچ بتاؤں، میں خوش تھی بھی۔

وہ اس وقت تک میرے حصے میں آنے والی سب سے قیمتی چیز تھا پھر میں اسے پا کر خوش کیوں نہ ہوتی۔

وہ معمولی معمولی باتوں پر مجھ سے الجھ پڑتا۔ مجھے میری رنگت، میری شکل کے طعنے دیتا۔ بعض دفعہ چیزیں اٹھا کر پھینک دیتا۔ بعض دفعہ بلند آواز سے مجھ پر چیختا چلاتا اور کبھی بہت زیادہ غصہ آتا تو مجھے خرچ دینا بند کر دیتا۔

مجھے یہ سب اس کی ادائیں لگتی تھیں اس کے نخرے نظر آتے تھے مجھے یہ سب برا نہیں لگتا تھا۔ اپنی عزت نفس کا گلا میں نے کچھ اس حد تک گھونٹ دیا تھا کہ اس چیز نے مجھے دوبارہ تنگ نہیں کیا۔ میں اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی۔ اس کا معمولی سے معمولی کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ اس کی گالیاں کھا کر بھی مسکراتی رہتی اس کے چیخنے چلانے پر بھی خاموش رہتی۔

وہ ضرورت کے وقت روپے نہ دیتا تو میں دوبارہ کبھی نہ مانگتی۔

وہ کہیں جانے سے منع کر دیتا تو میں کسی صورت بھی وہاں نہ جاتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ لوگ مجھے اس کی بیوی کی حیثیت سے جانیں۔ وہ مجھے چھپا دینا چاہتا تھا اور میں نے اس کام میں اس کی ہر ممکن مدد کی۔

بعض دفعہ تو مجھے اس پر ترس آیا کرتا تھا۔ آپ کو پتا ہے نا ترس صرف خوبصورت لوگوں پر ہی آتا ہے، ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگتا۔ میں سوچتی کہ یہ شخص کتنا عظیم ہے جو مجھے ناپسند کرنے کے باوجود مجھے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ اپنے گھر میں پناہ دیے ہوئے ہے۔ میرے اخراجات اٹھائے ہوئے ہے ورنہ کون ہے جو کسی ناپسندیدہ انسان کے لیے اتنا کچھ کرتا ہے۔

بعض دفعہ مجھے اس پر اتنا پیار آتا کہ میرا دل چاہتا میں اسے سجدہ کروں۔ آپ مجھے پاگل سمجھیں یا کفر کا فتویٰ لگائیں مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے فاروق کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

اس پر ہر رنگ سجتا تھا۔ بعض دفعہ وہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا تو میں اسے دیکھتی ہی رہ جاتی۔ میری نظر اس پر سے ہٹتی ہی نہیں تھی، پھر میں زبردستی اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹاتی کیونکہ مجھے ڈر لگنے لگتا تھا کہ کہیں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔ پھر مجھے اپنے وجود پر رشک آنے لگتا کہ وہ میرا ہے، مومنہ عادل کا ہے۔ نہیں مجھے مومنہ فاروق کہنا چاہیے۔

دو سال اسی طرح گزر گئے تھے۔ میری کوئی خدمت، کوئی تابعداری اسے پسند نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے بھی ناراض تھا۔ اب بھی اکھڑا ہوا تھا۔ پہلے بھی میں اس کے لیے بے وقعت تھی۔ اب بھی میری ذات اس کے لیے بے مصرف تھی۔

✡......✪......✡

پھر ان ہی دنوں میرے ہاں سنبل پیدا ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے کہ شاید میری اولاد کی رنگت سفید ہو گی اور صرف خواب نہیں میں نے بہت سی دعائیں بھی مانگی تھیں۔ مجھے بیٹا چاہیے تھا نہ بیٹی۔ مجھے تو جو بھی چاہیے تھا۔ خوبصورت چاہیے تھا۔ سفید رنگت والا چاہیے تھا۔ اپنے باپ کی طرح آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ میں اس لیے اپنی اولاد کو خوبصورت چاہتی تھی تا کہ اسے میرے جیسے حالات کا سامنا کرنا نہ پڑے اسے دھتکارا جائے، اس سے نفرت کی جائے نہ اس کا مذاق اڑایا جائے۔

آپ یہی سوچ رہے ہیں نا؟

میں جانتی ہوں۔ آپ یہی سوچ رہے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی اولاد کو کسی اور وجہ سے خوبصورت اور سفید چاہتی تھی۔ فاروق کو خوبصورتی پسند تھی۔ میں نے سوچا اگر اولاد اس جیسی خوبصورت ہوگی تو وہ اس سے خود بخود محبت کرنے لگے گا اور پھر میرے ساتھ بھی اس کا سلوک بدل جائے گا، یہ سب سوچنے میں میرا قصور نہیں تھا لوگ یہی کہتے ہیں کہ اولاد تو اچھے اچھوں کے دلوں کو بدل دیتی ہے اور خوبصورت اولاد تو باپ کی جان ہوتی ہے میں نے سوچا تھا۔

فاروق تو پہلے ہی خوبصورتی کا دیوانہ ہے جب خود اپنی اولاد خوبصورت ہوگی تو وہ کیوں نہیں اس کی محبت میں گرفتار ہوگا۔ اولاد کے لاڈ اٹھائے گا۔

مگر جو میں نے سوچا، وہ نہیں ہوا۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں جو سوچتی ہوں۔ ہوتا ہمیشہ اس کے برعکس ہے۔

سنبل بالکل میرے جیسی تھی، وہی سانولی رنگت، وہی معمولی سی شکل پہلی بار تو میرا دل ہی نہیں چاہا کہ میں اس پر نظر بھی ڈالوں۔ وہ مجھے اتنی عام سی لگی تھی کہ میرے دل میں اس کے لیے ممتا کا کوئی جذبہ نہیں جاگا۔

آخر اس نے اپنی شکل اور رنگت کی وجہ سے میرے بہت سے پلان تباہ کردیے تھے۔ میں یہ بازی بھی ہار گئی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا۔ میں خوب زور زور سے روؤں۔ آخر میرا قصور کیا تھا کہ خدا مجھے اس طرح کے "تحفے" دے رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی دو نمبر کا انسان بن کر ساری زندگی گزارنی تھی۔ سمجھوتوں اور پچھتاووں کی زندگی۔

سنبل کی پیدائش پر کسی بھی طرف سے جوش و خروش اور خوشی کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ پھوپھو اور پھوپھا بھی بیٹی کی پیدائش پر زیادہ خوش نہیں تھے مگر انھوں نے کسی ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ فاروق کا ردعمل بھی بہت نارمل تھا۔ سنبل اس کے رویے اور زندگی میں کوئی تبدیلی لے کر نہیں آئی تھی اور میں ہاں میرے لیے بھی اس کی آمد کوئی بہت بڑی خوشی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ بہت عام اور معمول کے انداز میں ہونے لگا تھا۔ فاروق کبھی کبھار سنبل کو پیار کرتا۔ اسے اٹھاتا تو مجھے اپنا وجود دنیا کا قیمتی ترین وجود لگتا۔ بے قدری اور بے وقعتی کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا، مگر اس کا پیار بہت عارضی سا ہوتا تھا۔

سنبل ایک سال کی تھی جب پھوپھا کا انتقال ہوگیا تھا اور ان کی موت کے تین ماہ بعد فاروق نے دوسری شادی کرلی تھی۔ خاندان میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ ہمارے خاندان میں پہلی بار کسی نے ایسا کیا تھا، میرے بھائی فاروق کو مرنے مارنے پر تل گئے تھے اور میرے ابو نے پھوپھو سے سارے تعلقات ختم کرلیے تھے۔ حالانکہ اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔

فاروق نے انھیں کچھ بھی بتانے یا ان سے اجازت لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میرا رشتہ مانگتے وقت پھوپھو نے کیا تھا۔

ہاں شادی سے ایک ہفتہ پہلے اس نے مجھے بتادیا تھا کہ وہ شادی کررہا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے، میں بہت روئی گڑگڑائی ہوں گی، میں نے بہت منت سماجت کی ہوگی کہ وہ ایسا نہ کرے یا مجھے بہت بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔

نہیں، آپ غلط سوچ رہے ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں جانتی تھی اسے دوسری شادی کرنی ہی ہے۔ میں کسی طور پر بھی اسے روک نہیں سکتی۔ پھوپھا کے مرنے کے دوسرے دن ہی اس نے مجھے شادی کی رات کو اپنی کہی گئی بات یاد دلا دی تھی اور میں تب سے انتظار میں تھی کہ وہ کب شادی کرتا ہے۔

میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ ایک ہفتہ بعد فاروق شادی کرلے گا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے، میں نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔

ہے نا یہی سوچ رہے ہیں نا آپ؟

نہیں میں نے قربانی نہیں دی تھی، مجھ میں تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں کسی کو یہ سب بتا سکتی۔ کیا آپ کو پتا ہے، کالی رنگت والے لوگ بہت بزدل، بہت کم ہمت ہوتے ہیں؟ پھر ویسے بھی سب کو بتانے سے کیا ہوتا تھا شادی تو فاروق نے ہر صورت کرنی ہی تھی۔ اگر میں، سنبل اور پھوپھو اس کو روک نہیں پائے تھے۔ اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکے تھے تو کیا کوئی اور روک لیتا۔

میرے گھر والے مجھے واپس لے جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فاروق مجھے طلاق دے دے یا پھر اس عورت کو...... خاندان میں ہر کوئی یہی چاہتا تھا حتیٰ کہ میری پھوپھو بھی۔

ہاں اگر کوئی نہیں چاہتا تھا تو میں نہیں چاہتی تھی۔ میں پچھلے تین سالوں سے مور کے پیر بن کر جی رہی تھی اور میں اس زندگی سے خوش تھی آخر میں مور کا حصہ تو تھی۔ گھر چھوڑ کر جانا، طلاق لینا بہت آسان ہوتا ہے، مگر ماں باپ اور بھائیوں کے گھر رہنا اور مطلقہ کی زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے گھر والوں کے دباؤ اور ان کی ناراضگی کے باوجود میں گھر چھوڑ کر نہیں گئی۔ فاروق اگر کسی کو طلاق دیتا تو مجھے ہی دیتا اور یہ بات میں جانتی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس سلسلے میں سوچنا شروع کردے۔ میں نے صبر کرلیا۔

آپ کو پتا ہے "صبر" کیا ہوتا ہے۔

✡......✪......✡

میں نے جب پہلی بار گل افشاں کو دیکھا تھا تو میں بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ بہت دیر تک میں اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پائی تھی۔ مجھے لگتا تھا میں نے حسن کو مکمل حالت میں دیکھ لیا ہے۔ پتا نہیں فاروق کو اس سے کتنی محبت ہوگی مگر کیا آپ کو یقین آئے گا کہ میں بھی پہلی ہی نظر میں اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی۔ وہ فاروق کے کسی دوست کی بہن تھی۔ فاروق نے اپنے دوست سے اپنی دوسری شادی کا ذکر کیا تھا اور اس دوست نے اپنی بہن کا رشتہ دے دیا تھا کیونکہ وہ بہت امیر نہیں تھا اور گل افشاں کی پانچ بہنیں اور بھی تھیں جن کے لیے رشتے کی تلاش میں اسے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔

فاروق شادی کے ایک ماہ بعد ہی اسے پھوپھو کے احتجاج کے باوجود گھر لے آیا تھا۔ پھوپھو نے اس سے بات کرنا تو درکنار اس کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ فاروق نے گل افشاں کو مجھ سے نہیں ملوایا تھا میں نے اسے دور سے ہی دیکھا تھا حالانکہ میں ملنا چاہتی تھی مگر پتا نہیں

فاروق کیوں خائف تھا۔

گل افشاں کو دیکھ کر میرے وجود میں کوئی ہلچل مچی تھی نہ کوئی طوفان اٹھا تھا۔ آخر اس نے میرا کیا لیا تھا؟

وہ پہلی رات تھی جب گھر میں رہتے ہوئے فاروق میرے کمرے میں نہیں آیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی مگر اس رات سنبل بھی میری طرح جاگتی رہی تھی۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ میری طرح وہ بھی خاموش تھی...... اس کی آنکھوں میں بھی آنسو نہیں تھے۔ میں ساری رات اسے گود میں لیے سوچتی رہی تھی کہ اب میں کون سا طریقہ کون سا حربہ استعمال کروں کہ یہ چھت میرے سر پر اور فاروق کا نام میرے نام کے ساتھ رہے۔ آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ میں نے کیا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

خدمت کا...... پہلے میں پھوپھو اور فاروق کی خدمت کرتی تھی۔ اب میں نے گل افشاں کو بھی اپنے آقاؤں میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اگلے دن صبح میں نئے جذبے سے اٹھی تھی۔ میں نے ان دونوں کے اٹھنے سے پہلے ہی دونوں کے لیے بہت زبردست قسم کا ناشتہ بنایا تھا اور فاروق کے آفس جانے کے لیے تیار ہوتے ہوتے میں نے ناشتہ ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ گل افشاں جب اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں آئی تو میں نے اسے ناشتے کی تیاری کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''نہیں...... میں اور فاروق صرف چائے پئیں گے۔''

بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پھر وہ چائے بنانے لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ چائے میں بنا چکی ہوں وہ میری بات پر کچھ جھنجلا کر بولی۔

''فاروق صرف میرے ہاتھ کی چائے پیتے ہیں۔''

میں نے اپنی شرمندگی اور خجالت مٹانے کے لیے کہا۔

''چائے تو وہ میرے اور پھوپھو کے ہاتھ کی بھی پی لیتے ہیں۔''

اس نے بہت سرد نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پینے اور پسند کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرے چہرے کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

مگر میں کچن سے باہر نہیں آئی، بلکہ مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر اس کے پاس رکھتی گئی، کپ، ٹی پاٹ، شوگر پاٹ، چمچے، ٹرے، چھلنی میں نے سارا سامان اس کے پاس لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ میری حرکات کو دیکھتی رہی پھر وہ چائے بنا کر اسی سامان میں لے گئی اور میں اتنی سی بات پر بے تحاشا خوش ہوئی۔

میں ہر روز صبح تھوڑا بہت سنگھار ضرور کیا کرتی تھی۔ اس دن بھی بے خیالی میں سنگھار میز کے سامنے آ گئی اور جب میں نے لپ اسٹک نکال کر اسے ہونٹوں پر لگانا تو میرا دل ہی نہیں چاہا۔

''میں یہ ساری چیزیں بھی اپنے چہرے پر تھوپ لوں۔ کیا تب بھی میں گل افشاں جیسی خوبصورت لگ سکتی ہوں نہیں نا تو پھر ان سب چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے اپنے دل میں سوچا تھا اور پھر میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہوا کاسمیٹکس کا سارا سامان درازوں میں مقفل کر دیا تھا۔ زندگی میں دوبارہ کبھی میں نے ان چیزوں کو خریدا نہ انھیں استعمال کیا۔



پھر میں فاروق اور گل افشاں دنوں کے لیے سراپا خدمت بن گئی تھی۔ میں نے گل افشاں کو کبھی کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیا نہ ہی میں نے اسے کبھی کچن کا کام کرنے دیا۔ میں سارا کام خود کرتی تھی حتیٰ کہ اس کے بہت سے ذاتی کام بھی تیل لگانے سے لے کر کپڑے دھونے تک۔

جواباً وہ کبھی کبھار مجھ سے ہنس کر بات کر لیا کرتی تھی اور بعض دفعہ سنبل کو بھی پیار سے چمکار لیا کرتی اور میں اتنی سی عنایت پر ہی نہال ہو جایا کرتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ گل افشاں کی اتنی خدمت فاروق کے دل کو کچھ موم کر دے گی مگر ایسا نہیں ہوا پتا نہیں کیا بات تھی میرے ساتھ اس کا رویہ بد سے بدتر ہی ہوتا گیا تھا۔

میں نے اس سے کبھی کوئی مطالبہ کیا تھا نہ کسی حق تلفی پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا مگر وہ پھر بھی خوش نہیں تھا۔ وہ مستقل طور پر گل افشاں کے کمرے میں ہی رہتا تھا اور میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

مگر پھوپھو نے اعتراض کیا تھا۔ انھوں نے فاروق سے کہا تھا کہ اسے دونوں بیویوں سے ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ مگر اس بات پر گل افشاں بہت بگڑ گئی تھی، اس نے نہ صرف گھر میں خوب ہنگامہ کیا تھا بلکہ کئی ماہ تک اس نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔ فاروق پر بھی پھوپھو کی نصیحتوں اور ہدایتوں نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی میرے کمرے میں بہت کم ہی آتا تھا۔

سنبل سے بھی پہلے وہ جو تھوڑا بہت لاڈ پیار کر لیتا تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ کئی کئی ہفتے وہ سنبل کا نام تک نہ لیتا پھوپھو زبردستی کسی دن اسے اس کے پاس بٹھا آتیں پھر وہ چند منٹ سنبل کے ساتھ کھیلتا اور پھر اسے واپس پھوپھو کو دے جاتا۔

فاروق اور گل افشاں کی زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ فاروق اس کا شیدا تھا۔ وہ جو کہتی وہ وہی کرتا۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتی، وہ چیز لانا فاروق پر فرض ہو جاتا تھا۔ وہ ہر شام اسے کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتا پہلے اس کے پاس ایک پرانی سی گاڑی تھی لیکن گل افشاں کے آتے ہی اس نے نئی گاڑی لے لی تھی۔

اس نے کبھی گل افشاں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ وہ کب کہاں جاتی ہے کتنا خرچ کرتی ہے، کیسا لباس پہنتی ہے باہر جاتے ہوئے پردہ کرتی ہے یا نہیں۔ یہ سوال کبھی فاروق نے گل افشاں سے نہیں کیے تھے۔ میں نے اپنے پورے وجود کو اس کی مرضی اور احکام کے مطابق ڈھال لیا تھا مگر وہ پھر بھی خوش نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر گل افشاں کی پسند اور خواہش کے مطابق ڈھال لیا تھا اور گل افشاں بہت خوش تھی۔

اور میں؟ میرے لیے تو بس یہی کافی تھا کہ میں اس گھر میں موجود ہوں۔ میرے نام کے ساتھ فاروق کا نام جڑا ہوا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کسی اور چیز کی خواہش ہی نہیں تھی۔

کیا آپ کو میری بات پر یقین آ رہا ہے کہ مجھے کسی اور چیز کی خواہش ہی نہیں رہی تھی؟

وقت اسی طرح گزرتا گیا تھا۔ ایک سال کے بعد میرے ہاں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ سنبل ہی کی طرح سانولی اور عام شکل و صورت والی۔ میرے کندھے اور جھک گئے تھے بوجھ اور بڑھ گیا تھا۔ دو بیٹیاں، دونوں سانولی، دونوں عام شکلوں والی مومنہ عادل والی کہانی دوبارہ پھر دہرائی

جائے گی۔ وہی نفرت، حقارت، بے قدری، بے وقعتی، عورت ہونا بہت مشکل کام ہے اور پھر کالی عورت ہونا تو۔

ملیحہ کو دیکھ کر میں بہت روئی تھی۔ مگر رونے سے کیا ہوتا ہے۔ آنسو دل کو موم کرتے ہیں نہ زمین کو سیراب یہ وہ پانی ہوتا ہے جو آنکھ سے بہتا ہے اور وجود کو گھلا دیتا ہے۔ پھر ایسا بار بار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ذات رہتی ہے نہ وجود۔

آپ حیران ہو رہے ہیں نا کہ میں فلاسفی کیسے بولنے لگی ہوں جب آپ دنیا کو سمجھ جاتے ہیں۔ مگر اپنے وجود کو سمجھ نہیں پاتے تو پھر آپ فلسفی بن جاتے ہیں مگر میں فلسفی نہیں ہوں کیونکہ میں دنیا کو کبھی بھی سمجھ نہیں پائی۔

✡......✪......✡

شادی کے دو سال بعد گل افشاں کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ بالکل اسی کی طرح سفید اور تیکھے نقوش والا۔ آپ کو پتا ہے ناں خدا جب نوازنے پر آتا ہے تو بہت کچھ دیتا ہے۔ فاروق تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اس نے منوں کے حساب سے مٹھائی بنوائی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے اس نے اپنے بیٹے کا عقیقہ کیا تھا۔

اس نے پورے خاندان کو بلایا تھا اور پورا خاندان ہی آیا تھا۔ وہ بھی جو مجھ سے ہمدردی کرتے رہتے تھے۔ وہ بھی جو گل افشاں کو ناپسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے بہن بھائی بھی آئے تھے۔ عجیب بات ہے ناں مگر آپ کو تو پتا ہی ہے۔ دنیا میں بہت ہی عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ فاروق نے گل افشاں کو تحفے میں ہیروں کا سیٹ دیا تھا اور پورے خاندان کے سامنے گل افشاں کے چہرے کی چمک مجھے اس وقت ان ہیروں سے زیادہ لگ رہی تھی۔

پتا نہیں پھوپھو کے دل میں کیا خیال آیا اور انھوں نے فاروق سے کہا کہ اسے مجھے بھی کچھ دینا چاہیے۔ فاروق اور گل افشاں کے چہرے پر ناگواری کی ایک لہر ابھری تھی پھر اس نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔

''تم کوئی سوٹ لے لینا۔''

اس نے کہا تھا، میں نے وہ روپے لے لیے۔ میں اس پر بھی بہت خوش تھی۔ گل افشاں حسن تھی۔ حسن کو سنگھار چاہیے میں بدصورت تھی میرے لیے یہی کافی تھا کہ میرا وجود کسی اچھے کپڑے سے ڈھک دیا جائے۔ مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں تھا۔

کیا آپ کو پتہ ہے ''اعتراض'' کیا ہوتا ہے؟

سنبل چار سال کی ہونے والی تھی میں اسے اب اسکول میں داخل کروانا چاہتی تھی۔ کسی بہت اچھے اسکول میں جب میں نے فاروق سے اسے اسکول بھیجنے کی بات کی تو اس نے کہا کہ وہ چند دنوں تک دو چار اچھے اسکولوں کے فارمز وغیرہ لا کر دیکھے گا پھر طے کرے گا کہ سنبل کو کہاں داخل کروانا چاہیے میں مطمئن ہو گئی مگر دوسرے دن اس نے بڑے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا کہ میں سنبل کو محلے کے کسی اسکول میں داخل کروا دوں کیونکہ وہ کوئی مہنگا اسکول افورڈ نہیں کر سکتا۔''

مجھے دھچکا لگا تھا وہ برانچ مینیجر تھا اور وہ اسے اچھے اسکول میں بھیجنا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے ہر ماہ صرف ایک ہزار روپے دیتا تھا۔ وہ گل

افشاں کو کتنے روپے دیتا تھا میں نہیں جانتی مگر وہ اسے ایک ہزار تو نہیں دیتا تھا وہ اسے وقتاً فوقتاً زیورات بنوا کر دیتا رہتا تھا وہ ہفتے میں ایک دو بار شاپنگ پر بھی ضرور جاتی اور جب آتی تو سامان سے لدی پھندی ہوئی۔ پھر بھی اس کے پاس اپنی بیٹی کے لیے فالتو روپے نہیں تھے۔

پہلی دفعہ میرے دل میں ملال پیدا ہوا اگر یہ بیٹیاں نہ ہوتیں بیٹے ہوتے تو کیا پھر بھی وہ یہی کہتا اگر یہ مغیث کی طرح خوبصورت ہوتیں تو کیا پھر بھی وہ یہی کہتا، میں دو دن تک یہی سوچ کر دل گیر ہوتی رہی۔ پھر میں نے سنبل کو گھر کے پاس ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس اسکول کی فیس دو سو روپے تھی اور اسے اسکول میں داخل کرواتے ہی میرے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ میں نے ایک دن فاروق سے کہا کہ وہ مجھے تھوڑے زیادہ روپے دیا کرے کیونکہ ایک ہزار روپوں سے میرا گزارا نہیں ہوتا مگر وہ میرے مطالبے پر یک دم بگڑ گیا تھا۔

''کیوں گزارہ نہیں ہوتا؟ تم اتنے روپے کس چیز پر خرچ کرتی ہو جبکہ سب کچھ تو گھر میں میں لا کر دیتا ہوں۔ اپنی عیاشیاں کم کرو گی تو یہ روپے بہت کافی ہوں گے اور میرے پاس کوئی حرام کے روپے نہیں ہیں کہ تم منہ پھاڑ کر مانگو اور فوراً نکال کر دے دوں۔''

اس کا لہجہ اتنا تلخ اور آواز اتنی بلند تھی کہ میں چپ رہ گئی تھی۔ پھر میں نے اس سے دوبارہ رقم بڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ شروع میں وہ اس بات پر بھی بہت ناراض ہوا مگر پھر گل افشاں نے پتا نہیں اسے کیا سمجھایا تھا مگر یہ ہوا کہ اس نے مجھے اجازت دے دی۔ پھر ٹیوشن والے بچوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ مگر میں خوش نہیں تھی۔

کیا آپ کو پتا ہے، رزق حلال کمانے کے باوجود میں ''خوش'' کیوں نہیں تھی؟

✡......✪......✡

اگلے سال میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ ایک بار پھر سانولی رنگت اور عام شکل والا بیٹا مگر اس بار میں بہت خوش تھی۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا اللہ نے مجھے بیٹا نہیں اپنی پوری کائنات اٹھا کر دے دی تھی۔ میرا خیال تھا فاروق اب تو بہت خوش ہوگا مگر آپ کو پتا ہے وہ خوش نہیں ہوا تھا۔ اس کا ردعمل ویسا ہی تھا جیسے سنبل اور ملیحہ کی پیدائش پر تھا اس نے حذیفہ کی پیدائش پر مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ اور بچے نہیں چاہتا۔ تین بچے کافی ہیں۔ میں اس کا بوجھ اور ذمہ داریاں نہ بڑھاؤں۔

حذیفہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد گل افشاں کے ہاں بھی ایک اور بیٹا ہوا تھا۔ مغیث کی طرح ایاز کی پیدائش پر بھی فاروق نے بہت دھوم دھام سے عقیقہ کیا تھا۔ اس بار اس نے گل افشاں کو سونے کی بارہ چوڑیاں بنوا کر دی تھیں۔

اسے سنبل، ملیحہ اور حذیفہ کی پروا تک نہیں تھی مگر مغیث اور ایاز پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ جیسے کھلونے وہ انھیں خرید کر دیتا تھا جیسے کپڑے وہ ان کے لیے لے کر آتا تھا۔ ویسے کپڑے اور کھلونے میرے بچوں کے پاس نہیں تھے۔ سنبل بڑی ہو رہی تھی۔ بعض دفعہ مغیث یا ایاز کا کوئی کھلونا دیکھ کر مچل جاتی مگر میں اسے کوئی سستا کھلونا دلوا کر بہلا دیتی۔

دو سال بعد میں نے اپنا زیور بیچ کر بینک میں رقم جمع کروا دی تھی اور سنبل کو ایک بہتر اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ گل افشاں نے بھی مغیث کو شہر کی سب سے مہنگی مانٹیسوری میں داخل کروا دیا تھا۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوا۔

شکوہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟



ان ہی دونوں پھوپھو کی ڈیتھ ہوگئی۔ پھوپھو کی وفات کے بعد فاروق نے چھت پر ایک کمرہ کچن، باتھ روم اور اسٹور بنوا دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اوپر شفٹ ہو جاؤں۔ کیونکہ نیچے جگہ کم ہے۔ پندرہ مرلے کے اس بنگلے میں گل افشاں اور فاروق کے لیے اگر جگہ کی کوئی تنگی تھی تو وہ میرے ایک کمرے کی وجہ سے تھی۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

گل افشاں اب اپنا کھانا الگ پکایا کرتی تھی اور میں اپنا کھانا الگ پکاتی تھی لیکن صفائی کا سارا کام نیچے بھی میں ہی کرتی تھی اور مجھے کبھی اس بات پر شکایت نہیں ہوئی۔ بلکہ میں خوش تھی کہ میں فاروق اور گل افشاں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرتی ہی ہوں۔

وقت اسی طرح گزرتا تھا۔ مغیث اور ایاز کے بعد گل افشاں کے ہاں دو اور بیٹے عذیر اور رافع ہوئے۔ وہ خوش قسمت تھی کیونکہ اس سے شادی کے بعد سے فاروق کو پروموشن ملنا شروع ہوئے تھے اور لگاتار اس کی پروموشن ہوتی گئی تھی۔

سنبل کے بعد میں نے ملیحہ اور حذیفہ کو بھی اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ مگر گل افشاں کے بچوں اور میرے بچوں کے اسکول میں زمین آسمان کا فرق تھا میں تب بھی پرسکون تھی کہ کم از کم میں اس قابل تو ہوں کہ اپنے بچوں کو اسکول بھیج سکتی ہوں۔

پتا نہیں کیا بات تھی میرے تینوں بچے ہی تعلیم میں بہت اچھے تھے خاص طور پر سنبل۔ وہ بہت سمجھدار اور ڈسپلنڈ تھی اور بہت عجیب بھی۔ اس میں عجیب بات کیا تھی۔ یہ مجھے نہیں پتا بس وہ مجھے بہت عجیب لگتی تھی۔ اس میں میرے جیسے کمپلیکسز نہیں تھے اسے اپنی شکل اور رنگت پر کوئی افسردگی نہیں تھی نہ اس بات نے اس میں کوئی خوف پیدا کیا تھا۔

وہ بچپن سے ہر کلاس میں فرسٹ آتی رہی تھی اور پانچویں میں بھی اس نے اسکالرشپ لیا تھا۔ پورے سال میں میرے لیے سب سے بہترین دن وہ ہوتا۔ جب میں رزلٹ سننے بچوں کے اسکول جاتی تھی وہاں میرے ساتھ بڑا خاص قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا کیونکہ میرے تینوں بچے پوزیشن ہولڈرز ہوتے۔ صرف ایک دن کے لیے میں دوسرے والدین کے لیے ایک قابل رشک چیز بن جاتی تھی۔

ہے نا عجیب بات؟

انھیں سانولے اور عام شکل وصورت کے مالک بچوں کی وجہ سے اور خاص طور پر سنبل کی ماں ہونے کی وجہ سے۔

میں ہر سال رزلٹ سننے کے بعد گھر آنے پر اپنے بچوں سے کہتی کہ وہ فاروق کو اپنے رزلٹ کارڈ دکھائیں۔ پتا نہیں میں کس چیز کی تسکین چاہتی تھی حالانکہ فاروق رزلٹ کارڈ دیکھنے پر کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ بڑے عام انداز میں کہہ دیتا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ اچھی بات ہے۔''

ملیحہ اور حذیفہ تو اسی بات پر بہت خوش ہو جاتے۔ میری طرح مگر سنبل پتا نہیں کیوں ہر دفعہ کہتی۔

''پاپا! آپ دیکھ لیں۔ مغیث اور ایاز نے کوئی پوزیشن نہیں لی۔''

اس بات پر جہاں گل افشاں بگڑتی وہاں فاروق کے ماتھے پر بھی تیوریاں آ جاتیں۔ میرا سانس بھی اٹک جاتا۔ گل افشاں کہتی۔

''وہ کسی عام اسکول میں نہیں پڑھ رہے۔ شہر کے سب سے اچھے سکول میں پڑھ رہے ہیں۔ وہاں تو ایک سے ایک قابل بچہ پڑھتا ہے وہاں کا پاس ہونا بھی تمہاری پوزیشن سے زیادہ اہم ہے۔''

''مگر پوزیشن تو پوزیشن ہی ہوتی ہے۔''

سنبل پھر بھی کہے جاتی، میں زبردستی اسے وہاں سے لے جاتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی جھگڑا ہو۔ چوتھی کلاس تک ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ مگر پانچویں میں فرسٹ پوزیشن لینے کے بعد ملیحہ اور حذیفہ کی طرح فاروق کو شام کو رزلٹ دکھانے نہیں گئی تھی جب میں نے اسے فاروق کے پاس جانے کے لیے کہا تو اس نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

''پاپا کو رزلٹ کارڈ دکھانے سے کیا ہوگا۔ میرا گریڈ تو نہیں بڑھ جائے گا۔''

میں اس کی بات پر حیران رہ گئی تھی۔

''پھر بھی تمھیں پاپا کو بتانا چاہیے ناں۔'' میں نے اصرار کیا تھا۔

''انھیں پتا چل ہی جائے گا۔ ملیحہ بتا دے گی۔ مگر میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

اس نے اکھڑ انداز میں کہا تھا اور پھر وہ نہیں گئی تھی۔ بلکہ انعام میں ملی ہوئی کتابیں نکال کر پڑھتی رہی۔

پھر اکثر ایسا ہی ہونے لگا۔ میں چاہتی تھی وہ اپنی کامیابیوں کے بارے میں فاروق کو بتائے مگر وہ بتانا چاہتی ہی نہیں تھی۔

☆......✪......☆

مڈل میں اس نے ایک بار پھر اسکالرشپ لیا تھا اور عجیب تبدیلی جو اس میں آئی وہ یہ تھی کہ وہ مغیث کے بہت قریب رہنے لگی تھی۔ وہ مغیث اور ایاز دونوں کو ہوم ورک کروانے لگی۔ گل افشاں اس بات پر بہت خوش ہوئی تھی کیونکہ سنبل کے پڑھانے کی وجہ سے دونوں کے گریڈز بہتر ہونے لگے تھے۔ پھر ایک دن وہ اچانک فاروق کے پاس جا پہنچی تھی اور اس نے کہا تھا۔

''پاپا! مجھے نیچے ایک کمرہ چاہیے، علیحدہ جہاں میں آرام سے پڑھ سکوں۔''

میں اس وقت صحن دھو رہی تھی۔ اس کے مطالبے پر میں حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ فاروق بھی کچھ حیران نظر آیا تھا۔ پھر اس نے گل افشاں کے چہرے کی طرف دیکھا جو خود بھی متذبذب نظر آ رہی تھی۔

''میں وہی کمرہ لے لیتی ہوں جہاں ہم لوگ پہلے رہتے تھے۔ کل میں اپنی چیزیں سیٹ کرلوں گی۔''

وہ خود ہی سب کچھ طے کر رہی تھی۔ فاروق ابھی بھی چپ تھا۔

''وہاں تو میں نے کچھ سامان رکھوایا ہوا ہے۔ کمرہ تو نیچے کوئی بھی خالی نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ضرور دے دیتی۔''

گل افشاں اچانک بولی تھی۔

''آنٹی! میں وہ سامان ساتھ والے کمرے میں رکھ دوں گی یا چلیں۔ وہ سامان وہیں رہنے دیتی ہوں۔ کیونکہ میرا کون سا بہت سا سامان ہے جو مجھے وہاں رکھنا ہے۔ بس کتابیں ہی تو ہیں۔ ٹھیک ہے ناں۔''

سنبل کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ یہ کہہ کر زیادہ دیر وہاں رکی نہیں تھی۔ بلکہ اوپر چلی گئی تھی۔ گل افشاں کے تیور بہت بگڑے ہوئے تھے مگر وہ خاموش تھی۔ فاروق کا چہرہ بھی بہت سنجیدہ تھا اور میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ وہ کیوں الگ کمرہ چاہتی ہے۔

اگلے دن صبح فاروق نے مجھ سے کہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ وہ نیچے نہ رہے۔ شاید اس سے گل افشاں نے کہا تھا۔ میں نے سنبل تک وہ پیغام پہنچا دیا تھا۔ وہ بالکل چپ رہی تھی مگر شام کو فاروق کے آتے ہی وہ نیچے چلی گئی۔

میں بھی لپکتی ہوئی اس کے پیچھے چلی گئی۔ وہ سیدھا گل افشاں کے کمرے میں چلی گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کمرے میں چلی جاتی وہیں دہلیز کے باہر ہی رک گئی۔

''پاپا! کیا آپ نے مجھے الگ کمرہ دینے سے انکار کیا ہے؟''

وہ بلند آواز میں فاروق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں کیونکہ نیچے کوئی کمرہ خالی نہیں ہے اور ویسے بھی تم ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں کہ تمہیں الگ کمرہ......''

سنبل نے باپ کی بات کاٹ دی تھی۔ یہ ہمت میں کبھی نہیں کرسکتی تھی۔

''مغیث اور ایاز بھی تو چھوٹے ہیں پھر آپ نے انہیں الگ کمرہ کیوں دیا ہے؟''

''وہ لڑکے اور تم لڑکی ہو۔ اس قسم کی فضول باتیں دوبارہ کرنے کے لیے میرے پاس مت آنا۔ میں نے بس ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ تم اوپر

ہی رہوگی تو بس تم اوپر ہی رہو۔"

فاروق اس بار اسے غصے سے ڈانٹ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر آپ نیچے مجھے اور ملیحہ کو ایک کمرہ بھی نہیں دے سکتے تو پھر آپ امی سے نیچے والے حصے کی صفائی بھی نہ کروائیں پھر آپ ان سے کام کیوں کرواتے ہیں؟"

وہ باپ سے خائف نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مجھے گل افشاں کی تیز آواز سنائی دی تھی۔

"وہ اپنی مرضی سے کام کرتی ہیں۔ ان سے کوئی کہتا نہیں ہے اور اگر وہ صفائی کر دیتی ہیں تو کوئی احسان نہیں کرتیں۔ تم لوگ بھی آخر اس گھر میں ہی رہتے ہو۔"

"لیکن ہم لوگ اوپر رہتے ہیں اور آپ بھی تو یہیں رہتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ہمارے چھت والے حصے کی صفائی کی ہے؟ پھر امی کیوں کریں؟"

"ٹھیک ہے، تم اپنی ماں سے کہہ دو۔ وہ صفائی نہ کرے اور تم اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں اب تمہاری مزید بکواس سننا نہیں چاہتا۔"

فاروق اس بار بہت زور سے بولا تھا اور سنبل کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی پھر مسکراتے ہوئے خاموشی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے گئی اور پہلی بار میں نے اسے بری طرح جھڑکا تھا مگر وہ بے حد پرسکون تھی۔

اگلے دن صبح جب میں نے صفائی کرنا چاہی تو گل افشاں نے مجھے روک دیا۔ پھر میں نے سنبل کی طرف سے بہت دفعہ معذرت کی تب اس نے مجھے کام کرنے دیا مگر بہت دیر تک وہ بڑبڑاتی رہی۔ اس نے مغیث اور ایاز کو بھی سنبل کے پاس ہوم ورک کرنے سے روکنا چاہا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی۔ ان دونوں نے اتنی ضد کی تھی کہ وہ انھیں روک نہیں سکی۔

✡......✪......✡

سنبل نے میٹرک میں بھی نہ صرف اسکول میں ٹاپ کیا تھا بلکہ بورڈ میں بھی اس کی تیسری پوزیشن تھی۔ یک دم خاندان میں سے ہر ایک زبان پر سنبل کا نام آ گیا تھا۔ میں سنبل کو دیکھتی تو حیران ہوتی رہتی اسے کسی قسم کا کوئی احساس کمتری نہیں تھا نہ سانولی رنگت کا نہ عام سی شکل کا۔

اس میں بڑا عجیب سا اعتماد تھا۔ خاندان میں سے کوئی بھی آتا، وہ بڑی روانی سے اس سے باتیں کرتی جاتی، چاہے وہ کوئی اس کا ہم عمر ہوتا یا اس سے بہت بڑا۔ وہ اٹھی ہوئی ٹھوڑی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی سنجیدگی سے بات کرتی رہتی۔ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس کی گفتگو میں اتنی ہی روانی اور لہجے میں ایسا ہی اعتماد تھا۔

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی، فاروق سنبل پر توجہ دینے لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ تعریف تھی جو وہ مختلف لوگوں سے اس کے بارے میں سنتا رہتا تھا۔ وجہ جو بھی تھی مگر وہ اکثر کسی نہ کسی بہانے سے سنبل سے بات کرتا رہتا۔

اس کے میٹرک کے رزلٹ کے بعد میں نے خاندان کے لوگوں کو ایک پارٹی دی تھی۔ اس دن غیر معمولی طور پر فاروق بھی بہت خوش تھا۔ پارٹی کا پورا انتظام اسی نے کیا تھا۔ میں بھی اس دن بہت خوش تھی مگر سنبل بہت سنجیدہ تھی۔ پھر پارٹی کے دوران ہی جب سنبل کی آئندہ تعلیم کا ذکر ہوا تو فاروق بہت پرخوش انداز میں کہنے لگا کہ وہ آگے بھی سائنس ہی رکھے گی اور میڈیکل کی فیلڈ کی طرف جائے گی۔ مگر سنبل نے ایک قہقہے کے ساتھ کہا۔

"آپ پڑھنے کے لیے گھر کا ایک کمرہ دے نہیں سکتے۔ میڈیکل کے لیے لاکھوں روپیہ کیسے دیں گے۔"

یک دم ہر طرف جیسے خاموشی چھا گئی تھی۔ فاروق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سب لوگوں کی معنی خیز نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ فاروق کمرے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد میں نے سنبل سے پوچھا کہ اس نے اس طرح کی بات کیوں کی اور وہ بھی سب لوگوں کے سامنے؟"

مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سنبل نے ایف۔ اے میں اکنامکس لے لی تھی۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ سنبل نے ایف۔ اے کرنے کے بعد بی۔ اے میں داخلہ لیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ملیحہ اور حذیفہ نے بھی فاروق کی خواہش کو رد کرتے ہوئے ایف۔ اے میں اکنامکس ہی رکھی تھی۔



فاروق نے ان دنوں شہر کے ایک پوش علاقے میں گھر کی تعمیر شروع کروائی تھی۔ مکان کی تعمیر میں ایک سال کا وقت لگا تھا اور وہ بنگلہ تیار ہونے کے بعد وہ گل افشاں کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا تھا۔ یہ ہم سب کے لیے ایک شاک تھا۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا، وہ ہمیں بھی ساتھ لے کر جائے گا اس سے بھی بڑا شاک ہمیں تب لگا تھا جب اس نے گھر کی نچلی منزل کرائے پر چڑھا دی تھی۔

میں پہلے کی طرح اب بھی خاموش رہی تھی مگر سنبل نہیں۔ اس نے فاروق سے بہت بحث کی تھی اور اس بحث کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے سنبل کو کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے بڑے ترش لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

"امی پلیز" آپ کچھ مت کہیں۔ ساری عمر شوہر کے سامنے خاموشی کے ساتھ گزاری ہے تو پھر ہمارے سامنے یہ تقریریں کیوں؟ آپ

نے اپنی زندگی اپنے طریقے سے برباد کی۔ اب ہمیں اس کو اپنے طریقے سے سنوارنے دیں۔ جو ہمارا حق ہے۔ اس کے لیے اگر آپ نہیں لڑسکتیں تو ہمیں تو لڑنے دیں۔''

زندگی میں پہلی دفعہ اس نے مجھ سے اتنی تلخی سے بات کی تھی۔ میں تو بس جیسے گم صم ہو کر رہ گئی۔

فاروق نے حسب معمول ناراض ہو کر جانے کے بعد اگلے ماہ خرچ کے لیے روپے نہیں بھیجے تھے۔ جب پہلی تاریخ کو گزرے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک دن سنبل نے مجھے کچھ روپے لا کر تھما دیے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

''یہ خرچ کے روپے ہیں، پاپا سے لائی ہوں۔''

میں مطمئن ہو گئی۔ مگر شام کے وقت اچانک فاروق گھر آ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت غصے میں ہے۔ سنبل اس وقت دوپٹے کے بغیر ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایزی چیئر میں جھولتے ہوئے ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔

اس نے فاروق کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا مگر نہ تو دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی جھولنا بند کیا تھا۔ ہاں کتاب بند کر دی تھی۔

''تم نے اسے روپے لینے کے لیے میرے دفتر کیوں بھیجا تھا؟''

اس نے آتے ہی سنبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں مجھ سے پوچھا تھا۔ میں بوکھلا گئی۔

''مجھے امی نے نہیں بھیجا تھا۔ میں خود گئی تھی۔ کیونکہ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت تھی۔ اگر آپ خود ہی وقت پر روپے دے جاتے تو میں کبھی آپ کے آفس نہ جاتی۔''

میں سنبل کی دیدہ دلیری اور اطمینان پر حیران تھی اور فاروق غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''تم اگر آئندہ کبھی میرے آفس آئیں تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے جب روپوں کی ضرورت ہو گی تو میں ضرور آؤں گی۔ آپ وقت پر روپے دے دیا کریں تو میں نہیں آؤں گی اور خرچ کے روپے بڑھائیں اتنے روپوں سے گزارا نہیں ہوتا۔ یہ 1999ء ہے 1299ء نہیں۔''

اس نے اپنی کرسی کو جھلانا بند کر دیا تھا۔ مگر کھڑی نہیں ہوئی تھی نہ ہی ٹانگ پر رکھی ہوئی ٹانگ کو نیچے اتارا تھا۔ فاروق ہونٹ بھینچے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا تھا۔

''سنبل! تمہیں کیا ہو گیا ہے، اس طرح کیوں کر رہی ہو؟'' میں نے فاروق کے جاتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

''کیا ہوا ہے امی! مجھے؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ روپے باپ سے نہیں مانگوں گی تو اور کس سے مانگوں گی اور میں نے ملیحہ اور حذیفہ سے بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں بھی جب روپوں کی ضرورت ہو تو وہ پاپا کے آفس چلے جایا کریں۔''

اس کا اطمینان برقرار تھا۔ اس نے ایک بار پھر کتاب کھول لی تھی اور کرسی پر جھولنا شروع کر دیا۔ مجھے جھرجھری آنے لگی تھی۔ وہ آخر کیا چاہتی تھی۔ وہ آخر یہ سب کیوں کر رہی تھی؟ میں ٹیوشنز کر کے ان کی ضرورتیں تو پوری کر رہی تھی پھر آخر اسے کس چیز کے لیے روپوں کی ضرورت تھی؟

میں بہت دیر تک غور سے اس کا چہرہ جو کہ بالکل مجھ سے مشابہ تھا دیکھتی رہی، رنگت بھی میری طرح ہی تھی مگر ہاں وہ میری طرح ہر وقت نظریں جھکائے نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی تھی۔ چاہے وہ میں ہو یا کوئی اور، چاہے وہ گل افشاں ہو یا پھر......پھر فاروق۔ اسے کوئی جھجک، کوئی خوف نہیں تھا۔

سانولی رنگت اور معمولی شکل کے باوجود وہ اپنے طریقے سے زندہ رہ رہی تھی۔ میری طرح دوسروں کی مرضی کے مطابق نہیں جی رہی تھی مگر کیسے؟ یہ ہنر اس نے کیسے سیکھا تھا۔ میں نے تو اسے کچھ نہیں سکھایا تھا میں نے تو اسے اپنے جیسی اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی کوشش کی تھی۔ میرا خیال تھا، کالی عورت صرف اسی طریقے سے زندگی گزار سکتی ہے مگر اس نے ان دونوں چیزوں کو اٹھا کر دور پھینک دیا تھا اور دوسروں کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوبصورت لوگوں کی طرح۔ سفید رنگ والوں کی طرح۔

میں اس کے مستقبل کے بارے میں بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔

✡......✪......✡

سنبل کی دوستی صرف مغیث اور ایاز کے ساتھ ہی نہیں تھی بلکہ عذیر اور رافع کے ساتھ بھی اتنی ہی تھی نہ صرف اس کی دوستی ان چاروں کے ساتھ تھی بلکہ بعض دفعہ وہ انھیں کسی نہ کسی بات پر جھڑک بھی دیتی تھی اور عجیب بات ہے کہ وہ بالکل خاموشی سے اس کی جھڑکیاں سنتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی آگے سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر مغیث تو اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا جب سنبل کا موڈ آف ہو جاتا تو وہ بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ اس سے معافی مانگتا۔

عجیب بات ہے ناں کہ وہ چاروں خوبصورت ہونے کے باوجود سنبل سے دبتے تھے۔ اس کی توجہ کے طالب رہتے تھے اور گل افشاں کی تمام تر برین واشنگ بھی انھیں سنبل سے برگشتہ نہیں کر پائی تھی۔

پہلے وہ چھپ چھپ کر اوپر آیا کرتے تھے مگر عمر بڑھنے کے ساتھ وہ کھلے عام اوپر آتے تھے اور گل افشاں بے بسی سے انھیں دیکھتی رہ جاتی تھی۔ سنبل نہ صرف انھیں ان کی سالگرہ پر تحفے دیتی رہتی تھی بلکہ دوسرے مواقع پر بھی انھیں کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھی۔ جواباً وہ بھی سنبل کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتے رہتے تھے اور بعض دفعہ ان کی کوئی چیز سنبل کو اچھی لگتی تو وہ اس کے انکار کے باوجود اسے دے کر ہی دم لیتے۔

علیحدہ گھر میں شفٹ ہونے کے باوجود ہفتے میں تین بار مغیث اور ایاز گھر ضرور آتے اور سنبل بھی ہفتے میں دو تین بار ان کے گھر سے ضرور ہو کر آتی۔

سنبل کے بی اے کے پیپرز ہونے والے تھے جب اس دن فاروق حسب معمول ماہانہ خرچ دینے آیا تھا۔ اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے مغیث آیا ہوا تھا۔ میں فاروق کے لیے چائے بنانے چلی گئی جب میں چائے لے کر واپس آئی تو سنبل فاروق سے کہہ رہی تھی۔

''پاپا! اب ایک کمرے میں گزارا کرنا بہت مشکل ہے، آپ یا تو ایسا کریں کہ ان کرایہ داروں کو یہاں سے نکال دیں اور ہم نیچے والی منزل پر شفٹ ہو جاتے ہیں۔ یا پھر آپ ہمیں اپنے ساتھ رکھیں۔

کیوں مغیث! ایک کمرے میں آج کل کے مہذب دور میں چار لوگ رہ سکتے ہیں؟''

اس نے براہ راست مغیث سے پوچھا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گئی۔

''نہیں پاپا! یہ تو کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ہے، آپ خود دیکھیں کہ ہم تو اتنے بڑے گھر میں رہ رہے ہیں اور یہ سب ایک کمرے میں۔ آپ نے خوامخواہ نیچے والا پورشن کرائے پر چڑھا دیا۔''

مغیث نے فوراً فاروق سے کہا۔ میں نے چائے کا کپ فاروق کو تھما دیا، جس کے چہرے پر الجھن نمایاں تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں نیچے والی منزل خالی کروا دوں گا۔'' کچھ دھیمی آواز میں اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''اور پاپا! مجھے کپڑوں کے لیے کچھ روپے چاہئیں۔ میری ایک دوست کی شادی آ رہی ہے۔ مجھے اسے تحفہ بھی دینا ہے۔''

سنبل نے ایک اور فرمائش پیش کر دی۔ فاروق نے کچھ کہے بغیر جیب سے دو ہزار روپے نکال کر اسے تھما دیے۔

میں حیرانی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار اس نے اس طرح میرے بچوں میں سے کسی کو اس کی فرمائش پر کچھ دیا تھا۔ فاروق کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مغیث کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سنبل نے وہ روپے مجھے تھما دیے۔

''مگر یہ تم اپنی کسی دوست......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں۔ کسی دوست کی شادی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو کیا میں اس قدر احمق ہوں کہ صرف کپڑے بنانے پر دو ہزار خرچ کر دوں۔ پاپا نے کبھی ہم لوگوں کو روپے نہیں دیے۔ انھیں ہمیں بھی اسی طرح جیب خرچ دینا چاہیے جیسے وہ مغیث وغیرہ کو دیتے ہیں اور اگلی بار میں پاپا سے یہی کہوں گی۔''

میں ایک دفعہ پھر حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ مغیث کی اس وقت وہاں موجودگی مجھے اب کوئی اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔

سنبل نے اسے فون کر کے بلوایا تھا یہ کہہ کر کہ اس نے اس کے لیے کوئی خاص ڈش بنائی ہے۔ اس نے خاص ڈش تو بنائی تھی مگر اس کے بدلے مغیث کو استعمال کیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ فاروق ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شام میں آتا ہے۔ میں سنبل کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

✡......✪......✡

اگلے ماہ اس نے اپنے اور اپنے بہن بھائیوں کے جیب خرچ کی بات کی تھی۔ اس بار مغیث کے ساتھ ساتھ ایاز بھی تھا۔ فاروق نے خاموشی سے یہ بات بھی مان لی تھی۔

دو ماہ کے بعد نیچے والی منزل خالی ہو گئی تھی اور ہم لوگ نیچے شفٹ ہو گئے تھے۔ پہلی بار وہ گھر صحیح معنوں میں مجھے اپنا لگا تھا۔ پہلی بار مجھے یوں لگا تھا کہ میں اس گھر کی مالکن ہوں۔ پہلی بار ہر چیز پر میرا اختیار تھا میں نے بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا بند کر دی تھیں۔ کیونکہ سنبل کا خیال تھا۔ اب اس

کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے گل افشاں اور فاروق کے کمرے کو مغیث اور ایاز کے لیے مخصوص کر دیا تھا کہ اگر کبھی وہ وہاں رکیں تو اس کمرے میں ٹھہریں۔ جواباً مغیث نے اپنے گھر کا ایک کمرہ سنبل کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور پھر سنبل وقتاً فوقتاً ان کے گھر جاتی اور ایک دو دن کے لیے ٹھہر بھی جاتی۔

بی اے میں بھی اس نے کالج میں ٹاپ کیا تھا اور پھر ایم اے اکنامکس میں داخلہ لے لیا تھا۔ ملیحہ اور حذیفہ بھی تعلیم میں اسی کی طرح بہت قابل تھے۔ سنبل کی طرح مجھے انھیں بھی کبھی کہنا نہیں پڑا کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ دیں یا اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

تب ایک بہت ہی عجیب بات ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائی نے اپنے بیٹے سکندر کے لیے سنبل کا رشتہ مانگا تھا۔ مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ سکندر بہت خوبصورت تھا۔ انجینئر تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی رنگت سفید تھی اور سنبل...... سنبل تو.......

میں نے سوچا شاید ایک بار پھر میری کہانی دہرائی جائے گی ایک بار پھر میرے بھائی نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میری بیٹی کا رشتہ مانگا ہے اور سکندر...... سکندر یقیناً بے خبر ہوگا۔

''سکندر پچھلے دو سال سے کہہ رہا تھا کہ ہم اس کے لیے سنبل کا رشتہ مانگیں مگر میں چاہتا تھا کہ سنبل آرام سے بی اے کر لے اور سکندر بھی اپنی جاب میں تھوڑا اسٹیبلش ہو جائے پھر میں رشتے کی بات کروں۔ اب تو خیر سے سکندر کی ترقی بھی ہو گئی ہے اور سنبل کا بی اے بھی مکمل ہونے والا ہے۔ اس لیے بہتر ہے۔ دونوں کی منگنی کر دی جائے، ایک سال بعد شادی کر دیں گے......''

مجھے اپنے بھائی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ سکندر نے خود رشتہ مانگا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سکندر کیوں ایک سانولی اور معمولی شکل کی لڑکی سے شادی کرے گا۔

میں نے سوچا اور بھائی کو وجہ بتائے بغیر انکار کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں انکار کر سکتی ہوں۔ وہ بہت دیر مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر میں نے ہاں نہیں کی۔

آپ حیران ہو رہے ہیں ناں کہ میں اپنی ضد پر ایسے اڑ سکتی تھی اور میں...... میں ضد کر ہی کیسے سکتی تھی۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں نے سب کچھ کیسے کیا تھا مگر بس میں نے بھائی کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

میں نے سنبل کو بتا دیا کہ میں نے سکندر کا رشتہ ٹھکرا دیا ہے۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا صرف خاموش رہی۔

اگلے دن سکندر خود ہمارے گھر آیا تھا۔ اس کی آمد کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا تھا اور کافی دیر بیٹھا سنبل سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے اس کی آمد پر کبھی اس لیے اعتراض نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ میرے سامنے ہی مختلف معاملات پر سنبل سے بحث کرتا رہتا تھا اور وہ بہت سنجیدہ اور سمجھدار تھا۔ بعض دفعہ جب کسی بات پر سنبل سے اس کا زیادہ ہی اختلاف ہو جاتا تو وہ خاموشی مگر ناراضگی سے اٹھ کر چلا جاتا مجھے تکلیف ہوتی کیونکہ آخر وہ میرا بھتیجا تھا میں سنبل کو سمجھاتی تو وہ کندھے اچکا کر رہتی۔

''ہر ایک کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے۔ میرا بھی ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ میں اس کے سکندر کی ہاں میں ہاں ملاتی جاؤں کیونکہ وہ ہمارے

گھر مہمان آیا ہے یا آپ کا بھتیجا ہے یا پھر اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت اور سفید رنگ کا مالک ہے۔''

میں اس کے آخری جملے پر ہمیشہ چونک جاتی۔ وہ میرے ہی چہرے پر نظریں جمائے بہت گہری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہوتی۔ مجھے لگتا جیسے وہ میرا ذہن پڑھ لیتی ہے ورنہ یہ بات......

''ویسے بھی امی! اسے کون کہتا ہے، یہاں آ کر مجھ سے حالات حاضرہ اور اکنامک افیئرز پر بحث کرے اور پھر اگر آپ میں دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ نہیں ہے تو بحث کرنی ہی نہیں چاہیے مگر اسے بحث کا شوق ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تو اپنی ہی بات کہوں گی، چاہے اسے پسند آئے یا نہ آئے۔''

وہ بڑی لاپروائی سے میرے چہرے سے کچھ دیر بعد نظریں ہٹا کر کہتی اور پھر کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔

سکندر کا غصہ بہت جلد ختم ہو جاتا تھا۔ دو چار دن کے بعد وہ پھر ہمارے گھر موجود ہوتا اور ایک بار پھر نئے سرے سے بحث کر رہا ہوتا۔

مگر رشتہ بھیجنے کے بعد وہ سنبل سے کسی بحث کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ مجھ سے پوچھنے آیا تھا کہ میں نے انکار کیوں کیا ہے؟ میں اسے کوئی وجہ نہیں بتا سکی مگر اپنے انکار پر جمی رہی۔

وہ بہت دلبرداشتہ ہو کر واپس گیا پھر وہ اکثر اسی بات کے لیے میرے پاس آتا رہا۔ اب وہ پہلے کی طرح سنبل سے بات نہیں کرتا تھا بلکہ آ کر سیدھا میرے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں، دلیلیں سنتی رہتی مگر اپنا فیصلہ نہ بدلتی۔

اس دن اس کے جانے کے بعد سنبل میرے پاس آئی۔

''امی! آپ اب اس قصے کو ختم کر دیں، یا تو اس رشتہ کو قبول کر لیں یا پھر اسے منع کر دیں کہ وہ یہاں مت آئے مجھے اس طرح ایک فضول چیز میں روز روز اپنے آپ کو گھسیٹنا اچھا نہیں لگتا۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگی، وہ خاصی بے زار لگ رہی تھی۔

''ویسے آپ اس کو انکار کی کوئی مناسب وجہ کیوں نہیں بتا دیتیں۔'' اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے اس کے سوال پر نظریں چرا لیں۔

''ٹھیک ہے پھر آپ اس سے کہہ دیں کہ اس معاملے پر دوبارہ کبھی آپ سے بات نہ کرے۔ اور ہاں امی! ایک بات آپ سے ضرور کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ میرے کمرے سے جاتے جاتے مڑ کر دروازے میں رک گئی۔

''ہر سفید شخص فاروق حسن نہیں ہوتا۔ آپ جس بات سے خوفزدہ ہو کر اس رشتے سے انکار کر رہی ہیں۔ وہ میرے لیے بالکل بے معنی ہے۔ مجھے زندگی گزارنا آتا ہے۔ اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنانا بھی جانتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی فاروق حسن جیسا سلوک نہیں کر سکتا۔''

وہ بڑے سکون سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں۔ ماں اولاد کے دلوں کا حال جان لیتی ہے مگر میرے ساتھ اس کے برعکس ہوا تھا۔ وہ میرے دل کی ہر کیفیت، ہر خوف، ہر سوال کو جانتی تھی اور پتا نہیں ایسا کب سے تھا۔

✡......✪......✡

میں نے فاروق کو بلوایا تھا۔ میں سکندر کے رشتے کے لیے ہاں کرنے سے پہلے اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ میری بات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

''تم ہوتی کون ہو، اس کی شادی کے بارے میں فیصلہ کرنے والی، کم عقل عورت! کیا میں مر گیا ہوں جو میرے ہوتے ہوئے تم خود اس کی شادی کے بارے میں فیصلے کرنے لگی ہو۔''

اس نے مجھے بری طرح جھاڑ دیا۔

''مگر میں تو صرف......'' میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

''میں مبین کے بیٹے کے ساتھ تو اس کی شادی کبھی نہیں کروں گا۔ میں ابھی تک وہ ہنگامہ اور تماشا بھولا نہیں ہوں جو اس نے میری دوسری شادی پر کھڑا کیا تھا اور ویسے بھی سنبل کے بارے میں فائزہ باجی ایک سال پہلے ہی مجھ سے بات کر چکی ہیں میں انھیں ہاں کر چکا ہوں وہ اپنا ایم اے مکمل کر لے پھر میں وہاں اس کی شادی کر دوں گا۔''

فاروق نے اپنی بڑی بہن کا نام لیتے ہوئے کہا۔ فائزہ کا بیٹا سفیان کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ سکندر کی طرح وہ بھی بہت خوبصورت تھا مگر میں اس کے مزاج کے بارے میں نہیں جانتی تھی کیونکہ وہ کافی عرصے سے سعودی عرب میں مقیم تھا۔

میں خاموشی سے فاروق کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آج بھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اس کی مخالفت کر سکوں، اس کے فیصلوں کے خلاف چل سکوں۔

''تم سنبل کو سفیان کے بارے میں بتا دینا، ہو سکتا ہے، اگلے ہی ہفتے باجی منگنی کر جائیں اور ایک بات میں واضح کر دوں۔ ملیحہ اور حذیفہ کے بارے میں بھی تم کوئی فیصلہ نہیں کرو گی۔ میں جہاں چاہوں گا۔ ان کی شادی کروں گا۔'' اس نے تیز آواز میں کہا۔

''کیوں پاپا! امی کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر سکتیں؟ اور آپ کو کیا حق ہے کہ آپ میری مرضی کے بغیر میری شادی کے بارے میں کچھ طے کریں۔''

وہ پتا نہیں کب لاؤنج میں آ گئی تھی۔

''میں تمہارا باپ ہوں۔ تمھارے بارے میں کچھ بھی طے کر سکتا ہوں۔''

''اولاد کی زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے صرف باپ ہونا کافی نہیں ہوتا اور بھی بہت سی چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔''

وہ دھیمے اور خشک لہجے میں بولی تھی۔

''اولاد کے لیے فیصلے باپ ہی کرتا ہے۔''

''ماں کیوں نہیں کر سکتی۔ کیا آپ کل مغیث اور دوسرے بیٹوں کی شادی کے لیے لڑکی کے انتخاب کا اختیار اپنی بیوی دوسری بیوی کو نہیں دیں گے؟''

''ہاں دوں گا مگر تمہاری ماں فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس کے پاس نہ شکل ہے نہ عقل۔ یہ ہر لحاظ سے بہت معمولی ہے۔''

مجھے لگا تھا اس نے میری بیٹی کے سامنے میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا تھا۔

''میرے سامنے دوبارہ یہ لفظ معمولی کبھی استعمال مت کیجئے گا جو خود معمولی ہوتا ہے، وہی دوسروں کے لیے یہ لفظ استعمال کرتا ہے۔ مجھ سے پوچھیں، آپ اس عورت کے مقابلے میں مجھے کتنے چھوٹے، معمولی اور عام لگتے ہیں۔ میری ماں کے پاس نہ شکل ہے نہ عقل۔ آپ کے پاس تو تھی نا؟ اپنی ساری ڈگریوں اور اعزازات کو اپنے آفس کی دس منزلہ عمارت کے باہر رکھ کر جلا دیں اور لوگوں کو بتائیں کہ آپ نے پچھلے تیس سال میں اپنے ذہن کو صرف اپنی بیوی اور بچوں کو ٹارچر کرنے کے طریقے ڈھونڈنے میں استعمال کیا ہے۔''

اس کی آواز بے حد تیز اور چہرہ سرخ تھا۔ فاروق کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور میں...... میں سکتے کے عالم میں تھی۔

''آپ کو یہ عورت بدصورت لگتی ہے۔ کالی لگتی ہے بے عقل لگتی ہے۔ مجھ سے پوچھیں۔ مجھے یہ عورت کیا لگتی ہے۔''

وہ بات کرتے کرتے میرے پاس آ گئی تھی پھر بہت اچانک اس نے میرے گلے میں اپنے بازو ڈالے اور بہت نرمی سے میرا چہرہ چوم لیا۔ میرا سانس رک گیا میں نے فاروق کو دیکھا۔ کیا آپ یقین کریں گے زندگی میں پہلی بار میں نے اس کا چہرہ سیاہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ پہلی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں تاریکی دیکھی۔ پہلی دفعہ میں نے اس کے وجود کو کپکپاتے دیکھا۔

''میں آپ کو بتاؤں، اس عورت کے سامنے آپ تو مجھے نظر ہی نہیں آتے۔ آپ کو پتا ہے آپ جس وقت اس عورت کے سامنے آتے ہیں تو آپ کی حیثیت اور جسامت ایک چیونٹی جتنی بھی نہیں رہ جاتی۔ میرے دل میں آپ کے لیے کتنی نفرت، کتنا زہر ہے۔ یہ آپ نہیں جانتے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کیا ہے۔ آپ کے بارے میں مجھ سے وابستہ لوگ نام کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ ایک جملہ تک نہیں، آپ نے بائیس سال کی زندگی میں مجھ پر اتنا اثر بھی نہیں چھوڑا کہ میں آپ کے لیے کوئی اچھا سا ایک جملہ بھی کہہ سکوں میری ماں کے بارے میں کہا جانے والا ہر برا لفظ آپ کو میرے سامنے دلدل میں اتارتا گیا اور اب تو آپ کا پورا وجود اس دلدل میں چھپ گیا ہے۔ صرف آنکھیں بچی ہیں صرف آنکھیں۔''

وہ بولتی جا رہی تھی۔ کہتی جا رہی تھی۔ حذیفہ اور ملیحہ بھی لاؤنج میں آ گئے تھے۔ مگر بے تاثر چہروں کے ساتھ وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ فاروق یک دم چلتے ہوئے اس کے پاس آیا اور تیزی سے اس کے چہرے پر تھپڑ مارنا چاہا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ملیحہ اور حذیفہ بھاگتے ہوئے فاروق کے پاس کھڑے ہو گئے۔

''آپ نے ہم سے بات والی محبت نہیں کی۔ آپ کو مارنے کا حق بھی نہیں ہے میں مومنہ نہیں گل افشاں ہوں۔ کسی سے تھپڑ نہیں کھاؤں گی۔''

اس نے فاروق کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرا دیے اور پیچھے ہٹ گئی۔

''میں نے کیا نہیں دیا؟ تمہیں سنبل! کیا نہیں دیا؟'' فاروق کی آواز کسی کھائی سے آتی لگ رہی تھی۔

''آپ نے میری ماں کو کیا دیا؟ مجھ پر احسان نہ گنوائیں؟'' فاروق ہونٹ بھینچے چپ کھڑا رہا تھا۔

''نہیں پاپا! آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ نے تیس سال اس عورت کی اتنی تذلیل کی ہے کہ اب آپ کو بولنا ہی نہیں چاہیے۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں نہ آپ کی عزت۔ اس لیے میری زندگی کے بارے میں کچھ بھی طے کرنے کی کوشش نہ کریں، یہ حق میری ماں کا ہے اور یہ فیصلہ وہی کرے گی۔''

اس نے جیسے بات ختم کر دی تھی، فاروق بے اعتباری کے عالم میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھا تھا۔ اور پھر وہ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ مگر جانے سے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں کچھ دیکھا تھا۔ اور اس چیز نے میرے اعصاب کو سن کر دیا تھا۔ میں نے تیس سال میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

خوبصورت شخص کو روتے دیکھنا کتنا عجیب ہوتا ہے نا۔

اور میں نے یہ منظر بھی آج دیکھ لیا تھا۔ اور آپ کو پتا ہے۔ وہ کیوں رو رہا تھا۔

''شاید آپ سوچ رہے ہوں گے...... کہ وہ آنسو پچھتاوے کے تھے۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں گے وہ آنسو تذلیل کے تھے۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں گے۔ وہ آنسو دکھ کے تھے۔

نہیں آپ غلط سوچ رہے ہیں۔

وہ آنسو سنبل کو کھونے کے تھے۔

وہ آنسو صرف اس لیے امڈے تھے کہ سنبل نے مومنہ کو فاروق پر ترجیح دی تھی۔

ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ فاروق ہم میں سے کسی کو نہ سہی مگر سنبل کو ضرور چاہتا تھا۔ اسی کالی اور معمولی شکل کی سنبل کو۔

مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ سنبل نے ایک خوبصورت اور سفید باپ کے بجائے ایک کالی اور بدصورت ماں کا انتخاب کیوں کیا؟''

اس نے اس کی بات ماننے سے کیوں انکار کر دیا۔

آپ بتائیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی معمولی اور سانولی رنگت والا شخص کسی خوبصورت اور سفید رنگت والے کی بات ماننے کے بجائے کسی بدصورت اور کالی رنگت والے کی بات مانے۔ عجیب بات ہے نا اور آج ایسا ہی ہوا تھا۔

اور اب میں اس دیوار کے ساتھ کھڑی سوچ رہی ہوں کہ چند منٹوں پہلے آخر یہ ہوا کیا ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے میں سنبل سے پوچھوں کہ

کیا میں نے زندگی کے تیس سال صحیح گزارے ہیں یا غلط۔ مگر میں جانتی ہوں وہ کہے گی۔

''امی! آپ نے زندگی کو بہت غلط طریقے سے گزارا ہے، کالا یا عام شکل کا ہونا کوئی ایسا جرم یا گناہ نہیں ہے کہ انسان اپنے سارے حقوق سے دستبردار ہو کر خوبصورت لوگوں کی غلامی کرنے لگے۔''

میں جانتی ہوں، وہ کہے گی۔

''کالا رنگ اتنا بڑا عیب نہیں ہوتا کہ انسان اپنے وجود کو چھپانے لگے۔ یہ اتنی بری چیز نہیں ہوتی کہ آپ اپنی پوری زندگی کو رنگ کے اردگرد ہی گردش دیتے رہیں۔''

اور پھر وہ کہے گی۔

''آپ کا وجود تھا۔ آپ نے اس کو منوایا کیوں نہیں جیسے میں نے منوایا؟

آپ کے حقوق تھے، آپ نے وہ لیے کیوں نہیں جیسے میں نے لیے؟

آپ نے زندگی کی ریس سفید اور خوبصورت رنگت والوں کے لیے صرف اس لیے چھوڑ دی کیونکہ آپ کی رنگت کالی تھی۔''

میں جانتی ہوں۔ سنبل کو زندگی میں میری طرح گھٹنوں کے بل گھسٹنا نہیں آتا اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میری جگہ وہ ہوتی تو فاروق حسن بھی وہ سلوک اس کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا۔ کالی اور عام سی شکل ہونے کے باوجود بھی۔

مگر مجھے یہ سارے ادراک، یہ سارے کشف پندرہ منٹ پہلے ہی تو ہوئے ہیں اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں گزرے ہوئے تیس سال کا سوگ مناؤں یا آنے والے سالوں کا جشن یا......

یا پھر گھٹنوں کے بل گر کر خدا کا شکر ادا کروں کہ اس نے دنیا میں کسی ایک انسان کے لیے تو میرا وجود، میری ذات غلاف کعبہ جیسا بنایا۔ سیاہ اور مقدس۔ اور وہ انسان سنبل ہے۔

آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ تو بتا سکتے ہیں۔

✡......✪......✡

دوسرا دوزخ

میرے پیارے اللہ!

"آپ کے نام یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے، بچپن میں ایک بار ایک کہانی پڑھی تھی...... ایک یتیم بچے کی کہانی، جسے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے نام ایک چٹھی لکھتا ہے، وہ چٹھی ڈاک خانے والے کھول لیتے ہیں اور پھر اس بچے پر ترس کھاتے ہوئے کچھ رقم اکٹھی کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھیج دیتے ہیں۔

تب وہ کہانی پڑھتے ہوئے مجھے ترس سے زیادہ اس بچے پر رشک آیا تھا، جس پر دنیا نے ترس کھا لیا......

مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں ایک وقت ایسا آئے گا، جب مجھے بھی اللہ کے نام ایسا ہی ایک خط لکھنا پڑے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا اس خط کو کھول کر پڑھنے کے بعد بھی کبھی مجھ پر ترس نہیں کھائے گی...... یا شاید لوگ کبھی اس خط کو پڑھ ہی نہیں پائیں گے......"

"نہیں کیا یہ کہوں کہ پڑھنا نہیں چاہیں گے۔"

"نہیں...... کیا...... کہوں کہ یہ خط ان تک پہنچ ہی نہیں پائے گا......"

کاغذ پر سیاہی سے لکھی ہوئی تحریر دیکھی جا سکتی ہے۔ پڑھی جا سکتی ہے...... سوچ کی لہروں پر بھیجی جانے والی تحریر کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں...... لکھنے والے اور اللہ کے سوا......؟ میری خواہش تھی، میں بھی اس بچے کی طرح ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھتی اور پھر اسی طرح لفافے پر اللہ کے نام لکھ کر ڈاک کے سپرد کر دیتی، مگر میں ایسا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

لکھنے کے لیے ہاتھ میں قلم اور کاغذ ہونا چاہیے، میں دونوں چیزیں تھامنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں اپنا ہاتھ بستر سے اٹھا نہیں سکتی۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش کروں گی تو میرے جسم پر موجود زخموں سے خون رسنا شروع ہو جائے گا۔ قلم ہاتھ میں تھاموں گی تو ہتھیلی کا ماس قلم کے ساتھ چپک جائے گا۔ انگلیاں موڑوں گی تو میرے Knuckles (انگلیوں کے جوڑ) پر پڑنے والی دراڑیں ہاتھوں کے باقی ماندہ گوشت کو برہنہ کر دیں گی۔ آنکھیں مسلسل کھلی رکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ درد کم کرنے کی دوائیں، مجھے ہوش میں رہنے نہیں دے رہیں۔ درد مجھے ہوش کھونے نہیں دے رہا۔

میں بول کر کسی دوسرے کو بھی خط نہیں لکھوا سکتی، میں الفاظ اکٹھے کرنے کے قابل نہیں رہی میرا ذہن درد اور اذیت سے ماؤف ہو رہا ہے، میرے منہ سے کراہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل پا رہا۔ اور تکلیف اتنی ہے کہ میں...... میں کراہ بھی نہیں پا رہی۔ منہ کھولنے کی کوشش میں میرے چہرے کی جلی ہوئی جلد اور گوشت چٹخنے لگتا ہے۔ خون اور پیپ رسنے لگتی ہے۔ لفظ کراہ بن جاتا ہے۔

میو ہاسپٹل کے برن یونٹ میں ایک بستر پر میں اپنی زندگی کے آخری گھنٹے گزار رہی ہوں، میرا ستر فیصد جسم جل چکا ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے لاعلاج قرار دے دیا ہے۔

''یہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں مر جائیں گی۔'' میں نے اپنے بستر سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر کو کچھ دیر پہلے کہتے سنا تھا۔ وہ پتا نہیں کس سے مخاطب تھا۔

''امی سے......ابو سے......مہوش سے......سجاد سے......لئیق سے پتہ نہیں کس سے......؟''

مگر اس نے یہ کہا ضرور تھا، میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا......کان......؟ پتہ نہیں انہیں کان کہنا اب ٹھیک ہوگا یا نہیں...... جلنے کے بعد چیزوں کو کوئلہ کہتے ہیں یا راکھ......جلی ہوئی عورت کو کیا کہتے ہیں؟ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں جن سوالوں کے جواب تلاش کر رہی ہوں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

میری ناک میں لگی ہوئی آکسیجن کی نالی دنیا میں میری آخری سانسوں کو ممکن بنا رہی ہے۔ میرے دائیں ہاتھ کی آبلہ بنی ہوئی پشت میں پیوست ایک ڈرپ قطرہ قطرہ کر کے میرے اندر وہ نمی پہنچا رہی ہے جو میرے وجود کو اس ہولناک اذیت سے چھٹکارا پانے بھی نہیں دے رہی۔ میں گردن سے پیروں تک ایک سلاخ دار پنجرے میں ہوں جس کو سفید رنگ کی ایک چادر سے ڈھانپا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ کپڑا میرے جسم سے نہ چھوئے۔ میرے جسم پر موجود گوشت، چربی، کھال سب کچھ جل کر صرف خون آلودہ اور پیپ زدہ ایک ڈھیر رہ گیا ہے۔ اور ڈاکٹر اس ڈھیر کو مزید کسی تکلیف سے بچانے کے لیے اس پر کپڑا چھونے نہیں دے رہے۔

میں اپنا ہاتھ اٹھا کر چہرہ چھو نہیں سکتی۔ مگر میں پھر بھی جانتی ہوں وہاں اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے چہرے کے سارے نقوش مسخ ہو چکے ہوں گے......

''ہاں......ہاں مگر آنکھیں......آنکھیں اب بھی باقی ہیں۔ آنکھیں اب بھی دیکھ سکتی ہیں......اور......اور دکھا بھی سکتی ہیں......میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے خود پر نظریں ڈالنے والے ہر شخص کی آنکھ کی پتلی میں اپنی شبیہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہر شخص نظریں چرا جاتا ہے۔ مجھے اپنی شبیہ نظر نہیں آتی......

چوبیس گھنٹے......

چوبیس گھنٹے......

چوبیس گھنٹے......

صرف چوبیس گھنٹے ہی تو گزرے ہیں، مجھے گوشت پوست کے ایک نارمل انسان سے جھلسے ہوئے اس بے شناخت ڈھیر میں تبدیل ہوئے۔ چوبیس گھنٹے پہلے میں اپنی انگلیوں کے پوروں سے اپنے چہرے کے ہر نقش کو محسوس کر سکتی تھی۔ ناک کی باریک اٹھی ہوئی نوک، ہونٹوں کی مخصوص ساخت، گالوں کی ملائم جلد بھنوؤں کے بال، دراز خمدار پلکیں، تھوڑی کا گڑھا، مسکرانے پر گالوں میں پڑنے والے ڈمپل، کانوں کی نرم لو اور

اس میں لٹکتی ہوئی بالیاں، کمر تک لمبے سیاہ گھنے اور ملائم بال جو بہت اچھی طرح باندھے جانے کے باوجود میرے ماتھے اور گالوں پر بکھرے رہتے تھے اور جنھیں میں ہر وقت کانوں کے پیچھے اڑستی رہتی......اور......دراز خمدار پلکوں والی سیاہ ہنستی ہوئی آنکھیں۔

اب وہاں کیا ہے؟ میں جانتی ہوں......میں نہیں جانتی۔

مجھے آپ کو تو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے لیے تو خط نہیں لکھ رہی، میں تو آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی......؟ آہ......مجھے یاد نہیں آ رہا۔

درد ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نرس میری ناک میں لگی ہوئی نالی کو ٹھیک کر رہی ہے۔ اس نے آکسیجن کے پریشر میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں رحم ہے، ترس ہے؟ خوف ہے؟ کیا ہے؟ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہو رہی ہیں۔

میرے بستر کے پاس کھڑے لوگ میری سانسیں گن رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے میں مر جاؤں......میں جانتی ہوں، وہ چاہتے ہیں میں اس اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں، مجھے علم ہے......میری بھی یہی خواہش ہے، میں بھی یہی چاہتی ہوں......مگر......مگر......وہ سوال جو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں......وہ یاد نہیں آ رہا......پتہ نہیں کیوں......کیوں یاد نہیں آ رہا......میں وہ سوال پوچھے بغیر......پوچھے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیسے مر جاؤں؟ مگر سوال......مگر سوال

میں یاد کر رہی ہوں، مجھے یاد آ جائے گا۔ کوئی میرے بستر کے پاس رو رہا ہے۔ میں آنکھیں کھولے بغیر بھی آواز پہچان سکتی ہوں......آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی ان سسکیوں کو شناخت کر سکتی ہوں......

وہ میری ماں ہے......پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں اسے اسی طرح اپنے سرہانے دیکھ رہی ہوں۔ جلے پیر کی بلی کی طرح وہ......میرے بستر کے گرد پھر رہی ہے......میرے دائیں جانب......پھر میرے بائیں جانب......دائیں جانب......بائیں جانب......وہ روتی ہے......چپ ہو جاتی ہے......ہاتھ میں پکڑے ہوئے پنج سورۃ سے آیات اور دعائیں پڑھتی ہے۔ مجھ پر پھونکتی ہے......مجھے دیکھتی ہے۔ پھر رونے لگتی ہے۔ وہ پھر کچھ پڑھتی ہے......پھر پھونکتی ہے......وہ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ تسلی دینے کے لیے نا محبت جتانے کے لیے۔

وہ میرا ماتھا چھوئے گی تو میرے ماتھے کی جھلسی ہوئی جلد اپنی جگہ چھوڑنے لگے گی......میں اور کراہوں گی......وہ میرا گال چومے گی تو وہاں موجود آبلے پھوٹ پڑیں گے۔ میں چیخوں گی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے گی اور میرے جھلسے ہوئے گوشت میں سے خون رسنے لگے گا۔ میں اذیت برداشت نہیں کر پاؤں گی......کبھی ماں کے لمس کو آپ نے اولاد کے لیے برچھی بنتے دیکھا ہے......؟ وہ روتی جاتی ہے۔ میرے بستر کے گرد چکر کاٹتی جاتی ہے۔

نو ماہ اس عورت نے اپنے جسم کے اندر مجھے تخلیق کیا ہے۔ کس کو......میری ہڈیاں، میرا گوشت، میری جلد، میرا خون......سب کچھ اسی کے وجود ہی کا ایک حصہ تھا۔

بیس سال پہلے اس نے ایک مکمل وجود کو جنم دیا تھا، ہنستے کھلکھلاتے، ایک مکمل وجود کو...... بیس سال بعد اس مکمل وجود کو جھلسے ہوئے پیپ زدہ گوشت کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وہ کیا سوچ رہی ہو گی......؟ اسے قرار کیسے آ سکتا ہے......؟

''بالوں میں تیل لگایا کرو سمن! اس طرح لا پروائی مت برتا کرو......'' میں اب بھی اس کی آواز سن سکتی ہوں۔ مگر اب میرے سر پر جھلسی ہوئی جلد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کوئی ابٹن اب میرے چہرے کی رنگت کو بدل سکتا ہے نہ اس کی ملائمت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

''کتنے کھردرے ہو رہے ہیں تمہارے ہونٹ...... بالائی لگاؤ ان پر۔'' وہ اب شاید شناخت بھی نہیں کر سکتی کہ میرے ہونٹ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہو جاتے ہیں؟

اس کا خریدا ہوا کوئی لباس اب میرے جسم کو دوسروں سے ممتاز نہیں کر سکتا تھا۔ بیس سال اس نے جس شاہکار کو تخلیق کرتے اور حفاظت سے رکھتے ہوئے گزار دیے تھے اسے کچھ دوسرے لوگوں نے چند ہی گھنٹوں میں ناقابل شناخت کر دیا تھا......

وہ کس کس کا چہرہ نوچنا چاہتی ہو گی؟ کس کس کو بے شناخت کر دینا چاہتی ہو گی؟ برن یونٹ کے اس بستر پر کس کس کو دیکھنا چاہتی ہو گی؟ پتہ نہیں...... پتہ نہیں...... نو ماہ اس نے مجھے اس اپنے جسم میں رکھا اور بیس سال اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح میرے بستر کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔

میں سوچ رہی ہوں اللہ! آپ مجھے اس حال میں دیکھ کر کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ تخلیق تو مجھے آپ نے ہی کیا ہے۔ کئی صدیاں تو مجھے آپ نے بھی اپنے پاس رکھا ہے۔ میری آنکھیں، ناک ہونٹ...... سب کچھ آپ نے ہی بنایا تھا۔ اب اس جھلسے ہوئے جسم کو دیکھ کر آپ کیا سوچ رہے ہوں گے، جس چیز کو آپ نے بنایا...... انسان نے اسے بگاڑ دیا، جلا دیا، مسخ کر دیا...... آپ مجھے دیکھتے ہوئے کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے؟ میری ماں کی طرح کیا آپ بھی بہت سے لوگوں کو......

''کب......؟''

''کب......؟''

میں اب ڈاکٹر کی آواز اپنے قریب سن رہی ہوں۔ وہ ایک بار مجھے دیکھنے آیا ہے۔ میں اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے قریب کھڑے اپنے باپ کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی بے یقینی ہے جو پچھلے چوبیس گھنٹوں سے جیسے اس کے چہرے پر کندہ ہو گئی ہے۔ اسے یقیناً اب تک یقین نہیں آیا ہو گا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی بیٹی کے ساتھ ہوا ہے......

اخبار میں چھپی ہوئی سرخی پڑھنے اور اسے اپنے سامنے مجسم حالت میں دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ''پھر اگر آپ اس ''سرخی'' سے خونی رشتہ رکھتے ہوں تو......؟''

پچھلے چوبیس گھنٹوں میں، میں نے اس کے ہاتھوں میں انجکشنز کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا وہ انجکشنز لاتا ہے۔ نرس ان انجکشنز کو ڈرپ

میں منتقل کر دیتی ہے۔اس کے جھریوں زدہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈاکٹر کے نسخے اب کچھ بھی واپس نہیں لا سکتے...... نہ میرا چہرہ...... نہ اس کے نقش...... نہ میرا بے داغ جسم...... نہ میری...... نہ میری زندگی...... ہاں ان ہاتھوں سے وہ اگر کچھ روپے زیادہ کما لیتا تو آج میرا وجود جلے ہوئے گوشت کے اس ڈھیر میں تبدیل نہ ہوا ہوتا۔اس کے چہرے کی بے یقینی اب شکست خوردگی میں تبدیل ہوگئی ہے۔کبھی نہ کبھی انسان ہار مان ہی لیتا ہے۔ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔اور بیٹیوں کے مقدر سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز باپ کے کندھوں کو نہیں جھکا سکتی۔

دوسری بیٹی کو بیاہنے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا وہ...... مہوش کو......

''میرے جیسے بھائیوں کو موت آ جانی چاہیے، جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جہیز نہیں دے سکتے۔''

''سجاد...... سجاد...... کہاں ہے......؟''میں نے اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دیکھا ہے۔تب جب کل رات کو وہ حیدر آباد سے میرے جلنے کی خبر سن کر آیا تھا۔اس کی آنکھیں سرخ اور کپڑے بے ترتیب تھے۔میں تب ہوش میں تھی اس نے آگے بڑھ کر صرف ایک نظر مجھے دیکھا تھا، میری اور اس کی نظر ملی پھر وہ کچھ کہے بغیر الٹے قدموں وارڈ سے بھاگ گیا۔مگر بلند آواز میں رونے کی آواز اندر تک آتی رہی، وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

''میرے جیسے بھائیوں کو موت آ جانی چاہیے جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جہیز نہیں دے سکتے......''پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز غائب ہوئی۔اور اس کے بعد وہ دوبارہ اندر نہیں آیا۔

شاید وہ میرا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا......شاید کوئی بھی میرا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔پھر بھی سب کو میرے سامنے آنا پڑ رہا ہے۔کیا ان میں سے کبھی کسی نے یہ سوچا ہوگا کہ زندگی میں ایک بار وہ بھی اخبار کی ایک خبر کا حصہ بن جائیں گے...... یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میں...... میں اخبار کی ایک خبر بن جاؤں گی۔

''کم جہیز لانے پر ایک لڑکی کو زندہ جلا دیا گیا۔''

''سسرال کے ہاتھوں بہو کا قتل......''

''جہیز نے ایک اور لڑکی کو برن یونٹ پہنچا دیا۔''

''ایک سال کے بیٹے کی ماں کھانا پکاتے ہوئے جل گئی۔''پتہ نہیں اخبار کی سرخی کس طرح لگی ہوگی؟

ایک سال کا بیٹا......؟

''عثمان......؟''

''ہاں وہ کہاں ہے؟ عثمان کہاں ہے؟ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔پتا نہیں اس نے کچھ کھایا ہوگا یا نہیں؟ دو دن سے اسے بخار تھا۔پتا نہیں آج اسے کوئی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہوگا یا نہیں......؟ میں اس کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔آخری بار...... دوبارہ تو کبھی......''

آنکھیں کھولنا میرے لیے مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ آکسیجن کی نالی کے ساتھ بھی سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر میرا ذہن، میرا ذہن ابھی...... ابھی بھی ماؤف نہیں ہوا...... چہرے، آوازیں اور چیزیں گڈمڈ ضرور ہو رہی ہیں مگر میں...... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں، سوائے اس سوال کے۔ اس سوال کے بس وہ...... وہ یاد نہیں آ رہا...... ورنہ...... ورنہ باقی تو سب کچھ یاد ہے مجھے...... سب کچھ......

یہ بھی کہ چوبیس گھنٹوں سے پہلے میں نے ہونٹوں پہ کون سی لپ اسٹک لگائی تھی۔ اسکارلٹ ہاں یہی، یہی رنگ تھا۔ مجاہد کہتا تھا یہ...... یہ رنگ مجھ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ اور چوڑیاں...... ہاں چوڑیاں بھی پہنی ہوئی تھیں میں نے...... گہری سبز رنگ کی چوڑیاں...... آگ کی لپٹوں میں آ کر شاید وہ بھی پگھل گئی ہوں گی۔ میرے وجود کی طرح۔

بچپن میں چوڑیوں کی چین بنایا کرتی تھی میں۔ موم بتی جلا کر چوڑی کے ایک سرے کو اس پر گرم کیا کرتی تھی۔ موم بتی کا شعلہ سیکنڈز میں ہی کانچ کو پگھلانے لگتا۔ پھر میں آرام سے اس پگھلے ہوئے حصے کو الگ کر دیتی اور اس جگہ سے برق رفتاری سے ایک چوڑی اس چوڑی کے اندر ڈال دیتی، پھر اتنی ہی تیزی سے پگھلے ہوئے سروں کو دوبارہ آپس میں زور سے دبا دیتی۔ کانچ ٹھنڈا ہو کر پھر آپس میں جڑ جاتا...... چین بنتی جاتی، یا پھر چوڑی کے ٹوٹے ٹکڑوں کو اسی طرح موم بتی کے شعلے پر گرم کرتی اور جب ٹکڑے کا درمیانی حصہ نرم ہو جاتا تو میں دونوں اطراف سے ٹکڑے کو پکڑ کر موڑ دیتی...... بیضوی شکل کے ان حصوں کو چین کی صورت لہراتی میں سارے گھر میں پھرتی۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی خود میرے وجود سے اٹھنے والے شعلوں کی لپٹیں میرے ہاتھوں میں کھنکتی ان چوڑیوں کے کانچ کو پگھلائیں گی اور اس بار کانچ پگھلنے اور نرم ہونے کے بعد میری ہی کلائیوں کو زنجیر کی مانند اپنی گرفت میں لے لے گا۔

اسکارلٹ لپ اسٹک، سبز چوڑیاں...... اور کپڑے...... کپڑوں کا رنگ کیا تھا؟ سفید...... ہاں سفید تھا...... سلک کا سفید کڑھائی والا سوٹ۔

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس سوٹ کی وجہ سے میرا جسم زیادہ بری طرح جلا، وہ سفید کپڑا...... سیاہ ہو کر اب بھی میرے جسم کے بہت سے حصوں پر چپکا ہوا ہے یوں جیسے وہ میری کھال کا ایک حصہ ہی بن گیا ہے۔ میرے جسم سے ان ٹکڑوں کو اتارنے کی کوشش کی جاتی، تو...... تو میرے جسم پر موجود آبلے پھوٹ پڑتے۔ کھال اتر جاتی۔ پھر شاید وہ زخم مجھے زندہ رہنے کے لیے چوبیس گھنٹے بھی نہ دیتے...... پھر شاید یہ اذیت چوبیس گھنٹے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔

مگر میں نے تو وہ لباس مجاہد کے لیے پہنا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں وہ کپڑے پہنوں...... اس نے کہا تھا وہ مجھے میری امی کے گھر لے کر جائے گا...... ہم شام تک وہیں رہیں گے۔

لیکن پھر...... لیکن پھر...... مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب اس نے میرے ساتھ کیا ہے...... اس نے...... میرے شوہر نے...... اس شخص نے جس نے قرآن کی آیات پر میرا کفیل بننے کا عہد کیا ہے۔ آپ کے سامنے اس نے میری حفاظت کا ذمہ لیا تھا...... دو سال...... پورے دو سال میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے...... دو سال میں نے اسے مقدور بھر آرام پہنچانے کی کوشش کی...... اس کو سلوٹ زدہ لباس سے بچانے کے لیے میں اپنے کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتی۔ اور اس نے...... اس نے میرے پورے وجود کو سلوٹ زدہ کر دیا......

''مجھے یقین نہیں آتا، مجھے یقین نہیں آتا...... مجاہد میرے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔ وہ تو میرا شوہر ہے...... مجھ سے محبت کرتا ہے، اس

نے مجھے کیسے جلا دیا؟ اس نے مجھے کیوں جلا دیا؟''

مگر ہو سکتا ہے اس نے مجھے نہ جلایا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے نہیں جلایا......سب کچھ ایک حادثہ تھا......حادثہ؟......ہو سکتا ہے سب کچھ ایک حادثہ ہی ہو......

''مگر......مگر وہ دروازہ......وہ دروازہ کیوں بند تھا؟

مجاہد میری چیخوں کی آواز پر کیوں نہیں آیا؟''

کوئی مجھے بچانے کیوں نہیں آیا؟ اور وہ جھلک......وہ جھلک......کھڑکی......مجاہد۔

''میرے خدا......میرا سانس پھر اکھڑ رہا ہے۔ کیا میں مر رہی ہوں؟ کیا موت کی تکلیف ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی میں اس وقت پچھلے چوبیس گھنٹوں سے برداشت کر رہی ہوں، اتنی لمبی موت......؟ اتنی مختصر زندگی؟ آپ نے مجھے کیا دیا؟ کیوں دیا؟

اٹھارہ سال میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارے......میں خوش تھی، پھر دو سال میں نے......میں نے کہاں گزارے، ہاں شادی ہو گئی تھی میری......ایف اے کے بعد......مجاہد سے......میں مٹھیوں میں خواب لے کر اس کے گھر آئی تھی۔ ہر لڑکی یہی کرتی ہے......میں بھی خواب لے کر ایک سراب میں داخل ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا مجھے چاہا جائے گا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ خوبصورتی، اخلاق، ایثار، خوش مزاجی، نرم خوئی، برداشت، تحمل، سمجھداری، سلیقہ......

گنتی ان سے شروع نہیں ہوئی تھی۔ گنتی کہیں اور سے شروع ہوئی تھی، ٹی وی، وی سی آر، فریج، زیور، موٹر سائیکل، میں شاکڈ رہ گئی، خوف نے مجھے اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا، میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھا وہ بے مول تھا......ساس، سسر، نندیں، شوہر، ہر ایک کی زبان پر ایک جیسے لفظ تھے......وہ تلخ تھے، زہریلے تھے۔ کانٹے تھے۔

''وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میں ہر بار خود کو یہی کہہ کر تسلی دیتی۔

''سسرال والے ایسی باتیں کرتے ہی ہیں۔'' میں سوچتی ''میں اپنی خدمت سے ان کے دل جیت لوں گی۔''

''ہاں خدمت سے، دلوں کو جیتا جا سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے وجود کے اندر دلوں کے بجائے ہوس اور لالچ کے بت پیوست ہوں ان کو......ان کو......''

دو سال میں نے سب کچھ برداشت کیا......سب کچھ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ عثمان کی پیدائش نے بھی کچھ تبدیل نہیں کیا۔ لیکن میں پھر بھی مطمئن تھی......میرا گھر قائم تھا، شادی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میری زبان پر ایک ہی ورد رہتا تھا۔ مجاہد کے مارنے پر بھی، ساس کے گالیاں دینے پر بھی، نندوں کے بے عزتی کرنے پر بھی......

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......'' میں خوش تھی، میرا گھر قائم تھا۔ میں ماں باپ پر بوجھ نہیں بن سکتی تھی۔ وہ

مجھے سہارا نہیں دے سکتے تھے......نہ معاشی طور پر نہ معاشرتی طور پر......اس گھر سے نکل جانے کی صورت میں معاشرہ مجھے کھا جاتا، میں وہاں سے نہیں نکلی اور آج میں یہاں ہوں۔

''پھر......پھر......سب کچھ ٹھیک ہونا شروع ہو گیا، میری دعائیں رنگ لانے لگیں۔ مجاہد نے مجھ سے اپنے رویے کی معافی مانگی......میں نے اسے معاف کر دیا۔ میری ساس، سسر، نندیں سب کا سلوک میرے ساتھ بدل گیا......میں خوش تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو بھی بتا دیا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے سب کچھ......وہ خوش تھے۔ پُرسکون تھے۔ میری وجہ سے ہونے والی اذیت ختم جو ہو گئی تھی۔

وہ چند ہفتے میری زندگی کے سب سے بہترین دن تھے۔ دو سال لگے مجھے سب کچھ ٹھیک کرتے۔ مگر سب کچھ ٹھیک ہو ہی گیا۔ آپ کو کیوں بتا رہی ہوں میں؟ آپ تو سب کچھ جانتے ہی ہیں......میری خوشی اور اطمینان کا اندازہ آپ سے بڑھ کر کس کو ہو سکتا ہے۔

کل بھی تو یہی ہوا تھا، مجاہد نے کہا تھا وہ مجھے میرے گھر لے کر جائے گا۔ ہم شام وہیں گزاریں گے۔ میرے لیے لباس کا انتخاب بھی اسی نے کیا۔ سلک کا سفید لباس، وہ اتوار کا دن تھا اتوار کو مجاہد گھر ہی پر ہوتا تھا۔ اتوار کو سب لوگ ہی گھر پر ہوتے تھے۔ مگر اس دن میرے سسر دوپہر سے کچھ دیر پہلے کہیں چلے گئے۔ میری دونوں نندیں بھی کہیں چلی گئیں، گھر میں صرف مجاہد اور میری ساس تھیں۔ میں صبح ناشتے کے بعد سے کچن میں نہیں جا سکی تھی۔ عثمان کے لیے فیڈر بھی مجاہد ہی تیار کر کے لایا۔ مجھے حیرانی ہوئی مگر اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔

دوپہر کے قریب اس نے مجھے تیار ہونے کے لیے کہا، میں دوپہر کا کھانا پکا کر تیار ہونا چاہتی تھی مگر اس نے روک دیا۔

''گھر میں امی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے تو کھانا کون کھائے گا؟ ہم تو ویسے بھی جا رہے ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ وہ دوپہر کا کھانا نہیں کھائیں گی تم بس جلدی سے تیار ہو جاؤ تاکہ ہم لوگ جا سکیں۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں اس کی بات مانتے ہوئے تیار ہونے لگی۔ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنے لمبے بال کھلے چھوڑ دوں۔ میں گرمی میں سلک کا سوٹ پہننا نہیں چاہتی تھی، مگر وہ بضد تھا کہ میں وہی کپڑے پہنوں میں تیار ہو گئی تھی جب اس نے مجھ سے چائے کی فرمائش کی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی، اسی وقت میں نے اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ڈیک کو بلند آواز میں بجتے سنا۔ مجھے حیرت ہوئی مجاہد کبھی اتنی بلند آواز میں ڈیک نہیں سنتا تھا مگر اس وقت......

کچن کے دروازے سے بہت دور ہی میں نے سوئی گیس کی تیز بو محسوس کر لی۔ یقیناً کچن میں کہیں سے گیس لیک ہو رہی تھی یا پھر چولہے کا والو کھلا رہ گیا ہوگا۔ میں کچھ فکر مندی سے اندر آئی، کچن میں گیس کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی، میں سانس روکتے ہوئے چولہے کے پاس آ گئی۔ دونوں برنرز کے والو پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں بند کرتی۔ میں نے اپنی پشت پر کچن کے دروازے کو ایک جھٹکے سے بند ہوتے سنا۔ میں بے اختیار پلٹی، میں دروازے کی طرف جانا چاہتی تھی مگر میں قدم اٹھا نہیں سکی۔ کچن کی کھلی کھڑکی سے ایک جلتی ہوئی دیا سلائی کو میں نے اڑ کر اندر آتے دیکھا۔ پھر ایک......ایک دھماکہ ہوا تھا۔ مجھے سب کچھ سمجھنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں چیخ رہی تھی۔ میں نے دروازے کی طرف بھاگ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ بند تھا، وہ نہیں کھلا، میں نے اس کو پوری قوت سے بجایا، وہ نہیں کھلا میں چیختی ہوئی کچن

میں موجود پانی کے نل کی طرف بھاگی، اس میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ ٹھنڈے اور گرم دونوں والوز کو گھمانے سے پانی نہیں آیا۔ آگ کے شعلے بڑھتے جا رہے تھے۔

باہر ڈیک بلند آواز سے بج رہا تھا، اندر میں چیخ رہی تھی۔ پھر میں کھڑکی کی طرف گئی اور تب......تب......آگ کی اٹھتی ہوئی لپٹوں سے میں نے کھڑکی کے باہر صحن میں مجاہد اور اپنی ساس کو دیکھا......ایک لمحے کے لیے......ایک لحظے کے لیے......بلند آواز میں چیختے ہوئے میں نے انھیں پکارا......وہ برق رفتاری سے اندر کمرے میں چلے گئے۔

میرا ذہن ماؤف ہو گیا......وہ میری طرف کیوں نہیں آئے؟ کیا انھوں نے خود مجھے؟ سب کچھ ختم ہونے لگا......کیا انھوں نے خود میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا......؟ مجھے تب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر دھواں جا رہا تھا۔ میں اب اپنے گوشت کے جلنے کی بو کو محسوس کر سکتی تھی۔ میری چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ میں اس کھڑکی کے سامنے گر رہی تھی۔ ڈیک اب بھی بج رہا تھا۔ سامنے میرے کمرے کا دروازہ بند تھا......اندر میرا بیٹا تھا۔ میرا شوہر تھا، میری ساس تھی، کچن میں میرے چاروں جانب آگ تھی......مجھے اس وقت صرف آپ یاد آئے تھے، صرف آپ یاد آ رہے تھے......کیوں یاد آ رہے تھے آپ......؟

زمین پر گرتے ہوئے میرے کانوں نے بیرونی دروازے کو دھڑ دھڑاتے اور بہت سے لوگوں کو بولتے سنا......اس کے بعد پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا......شاید کسی نے کچن کا دروازہ کھولا تھا......شاید کسی نے مجھ پر پانی پھینکا تھا۔ شاید کسی نے میرے گرد کوئی کمبل لپیٹا تھا......اس کے بعد میرے لیے ہر چیز شاید بن کر رہ گئی تھی۔

دوبارہ آنکھیں میں نے ہاسپٹل کے اسی بستر پر کھولی تھیں۔ میرے دائیں طرف ایک کرسی پر وہی تھا......مجاہد میرا شوہر......

''یہ سب ایک حادثہ تھا، تمھیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ میں نے ہمیشہ تم سے کہا تھا کہ احتیاط کیا کرو......'' میری کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ کہہ رہا تھا۔ اور میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

دو سال کسی جانور کو پاس رکھنے پر بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اسے ٹھوکر مارنے کے لیے بھی قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا اس شخص کو دو سال میں مجھ سے اتنی سی محبت بھی نہیں ہوئی تھی؟ مجھے آگ میں جھونکتے ہوئے اس نے مجھے انسان کے بجائے ایندھن کیوں سمجھا......؟ دو سال میں اس شخص کو پہنچنے والی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر میں تڑپ اٹھتی تھی......معمولی سی کھانسی ہوتی یا انگلی پر لگنے والی خراش......وہ جب تک ٹھیک نہ ہو جاتا مجھے چین نہ آتا......اور......اور......اس شخص نے مجھے اپنے ہاتھوں سے جلا دیا......

میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اطمینان تھا......ٹی وی، فریج، وی سی آر، زیور، موٹر سائیکل، کیا اس نے مجھے صرف ان چیزوں کی وجہ سے جلا دیا تھا۔ کیا صرف یہ چیزیں نہ لانے کی وجہ سے اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت بیٹھ گئی تھی۔ کہ میری دو سال کی خدمت اور اولاد بھی اس نفرت کو کم نہیں کر سکی۔

''ابھی پولیس آئے گی......تم انھیں بتا دینا کہ یہ حادثہ تھا......'' وہ اب مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''حادثہ نہیں تھا......تم لوگوں نے مجھے جلایا......''میں نے کراہتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہوگیا اور میرے چہرے پر نظریں گاڑے رہا۔

''تم پولیس کو یہ کہوگی؟''اس بار اس کی آواز میں اشتعال تھا۔

''ہاں......''

''پھر کیا ہوگا؟ تم نے سوچا ہے......تم مر جاؤ گی۔ میں جیل چلا جاؤں گا......عثمان کا کیا ہوگا......؟ وہ کہاں جائے گا؟ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کردو تم پولیس سے یہی کہنا کہ یہ ایک حادثہ تھا، اپنے بیٹے کے لیے......تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟''وہ اب مدہم آواز میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں! میں نے عثمان کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا......اس کا کیا ہوگا...... پولیس اس شخص کو پکڑ لے گی تو کیا ہوگا......؟ مقدمے کی پیروی کون کرے گا؟ یہ رہا ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اسے سزا ہوگئی تو عثمان کا کیا ہوگا......؟''میں خاموش ہوگئی۔

میرے پاس لفظ ختم ہوگئے۔ صرف زندگی باقی رہ گئی۔ عورت کے پاس صرف زندگی ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا......

میں نے اپنی ساس کو دیکھا، ان کے ساتھ محلے کی کچھ اور عورتیں تھیں، وہ رو رہی تھیں غش کھا رہی تھیں۔

''کاش میں سوئی نہ ہوتی...... کیوں نیند آگئی مجھے...... مجھے کیا پتا تھا میری بہو کے ساتھ یہ ہوجائے گا......اس کے بجائے میرے ساتھ یہ ہوجاتا......''وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میں انھیں دیکھ رہی تھی، میں نے اپنی ماں میں رحم کے علاوہ اور کوئی صفت نہیں دیکھی تھی۔ ماؤں میں رحم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا یہ میری خوش فہمی تھی۔ دو سال میں نے اس عورت میں بھی یہی صفت تلاش کرنے کی کوشش کی تھی کبھی نہ کبھی تو اس کی زبان کے کانٹے ختم ہوں گے۔ کبھی تو اس کے لفظوں کا زہر کم ہوگا......کبھی تو......لیکن سب کچھ بڑھتا گیا۔ انھیں مجھ پر رحم نہیں آیا۔ ٹی وی، فریج، وی سی آر اور موٹر سائیکل نہ لانے والی بہو پر رحم کیسے کیا جاسکتا ہے......؟ کیا انھیں احساس ہے کہ جلتے ہوئے جسم کی تکلیف کیسی ہوتی ہے......؟ جب پورا جسم موم بتی کی طرح پگھل رہا ہو۔ جلد، کھال، چربی، گوشت، سب کچھ جل رہا ہو اور انسان چاہنے کے باوجود شعلوں کو بجھا نہ سکتا ہو......تو......؟

میں اب اپنی نندوں کو دیکھ رہی تھی جو میری ساس کی طرح رو رہی تھیں۔ مجھے جلاتے ہوئے کیا انھوں نے یہ کبھی سوچا کہ اگر انھیں خود کبھی میری طرح جلنا پڑا......ان کو......یا کبھی آج سے کئی سال بعد ان کی بیٹیوں میں سے کسی کو......

دو سال میں نے کئی بار انھیں ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریروں کے کرداروں کے لیے آنسو بہاتے دیکھا ہے......کیا صرف رحم اور ہمدردی ان کے لیے ہونی چاہیے؟ جو زندہ نہ ہوں فرضی کردار ہوں......میرے جیسے حقیقی کرداروں کے لیے ان کے پاس......کیا میرے کم جہیز لانے کے ''گناہ''کو وہ معاف نہیں کرسکتی تھیں؟ کیا کبھی ایک بار وہ میری ساس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میرے ساتھ سب کچھ نہ کریں......مجھے تکلیف نہ دیں، کیا وہ مجاہد سے یہ سب نہیں کہہ سکتی تھیں......کیا وہ......''

پھر کچھ دیر بعد میرے گھر والے آ گئے...... پھر پولیس آ گئی، مجاہد اور اس کے گھر والے غائب ہو گئے تھے...... میں نے اس کے بعد انھیں نہیں دیکھا۔ میرے گھر والے انھیں الزام دے رہے تھے، محلے کے بہت سے لوگ بھی یہی کہہ رہے تھے...... پولیس کے ایک انسپکٹر نے مجھ سے بیان لینے کی کوشش کی۔

''کیا یہ حادثہ تھا؟ کیا مجھے میرے سسرال والوں نے جلایا؟ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا......؟ کچن کا دروازہ باہر سے کس نے بند کیا؟ کیا میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟ کیا مجھے کسی پر شک ہے؟ میرے سسرال والوں کا رویہ میرے ساتھ کیسا تھا؟ میرے شوہر کا سلوک کیسا تھا؟''

وہ مجھ سے ایک کے بعد ایک سوال پوچھتا رہا، خاموشی اور کراہوں کے علاوہ میرے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''سچ بتا دیں بی بی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

بستر مرگ پر پڑی اب میں کس سے ڈر سکتی ہوں......؟ مگر سچ...... سچ بتانے کی ہمت میرے اندر نہیں ہے۔ وہ معاشرے نے چھین لی ہے۔

وہ بہت دیر مجھے بولنے پر مجبور کرتا رہا پھر میری سانس اکھڑنے لگی تو ڈاکٹر نے اسے باہر بھیج دیا۔

''تم اسے بتا دو کہ یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ......'' اس کے جانے کے بعد میری امی نے کہا اور پھر بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگیں۔

میں ایک بار پھر غشی میں چلی گئی۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب...... اب جب ڈاکٹر میرے گھر والوں کو بتا چکے ہیں کہ میں کسی بھی لمحے مر جاؤں گی...... تو...... تو...... وہ سوال مجھے مرنے نہیں دے رہا...... وہی سوال جو...... جو مجھے یاد نہیں آ رہا......

''اوہ میرے اللہ......''

میری تکلیف...... میری تکلیف......

میرا ذہن......

آنکھیں...... آنکھیں نہیں کھل رہی۔

سانس...... سانس......

میرا جسم بے جان......

سب کچھ ختم......

میرا بیٹا......

کیا...... کیا یہ موت......

وہ سوال......

ہاں...... ہاں یاد...... یاد...... آ...... رہا ہے۔

میں......میں آپ سے......پوچھنا......پوچھنا چاہتی ہوں......

آپ نے کہا تھا......آگ کا عذاب صرف......

صرف اللہ......اللہ دے سکتا ہے......آپ دے سکتے ہیں......

اور کوئی نہیں......انسان نہیں......مگر مجھے......مجھے تو انسانوں......انسانوں نے آگ کا عذاب دے دیا ہے......

میں نے......میں......اسی دنیا میں دوزخ کے عذاب سے گزر رہی ہوں......بس فرق یہ ہے کہ یہ دوزخ انسان نے دہکایا ہے......

میں پوچھنا چاہتی ہوں اب......اب......جب میں مرجاؤں گی......تو......تو کیا آپ......آپ مجھے دوبارہ دوزخ......میں پھینکیں گے؟

دوسرے دوزخ میں......کیا آپ میرے لیے......دوبارہ دوزخ دہکائیں گے؟ دوبارہ مجھے اس میں پھینکیں گے؟

میں آپ کو بتانا......بتانا چاہتی ہوں......مجھے......انسانوں کے دوزخ......سے گزرنے......گزرنے کے بعد آپ کے دوزخ سے خوف نہیں آرہا......دوسرے دوزخ سے......اللہ کیا......کیا آپ......مجھے......

دوسرا......دوسرا دوزخ دیں گے؟ میں......آپ......سانس......میں......اندھیرا......گھٹن......

☆......✪......☆

ختم شد

☆......✪......☆